تاریخ اسلام



سلسلہ اشاعت امامیہ مشن لکھنؤ ۴۳۳

تاریخ اسلام

حصہ دوم

از قلم

سرکار سید العلماء الحاج مولانا السید علی نقی النقوی دام ظلہ
مجتہد العصر

مطبوعہ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

قیمت :- دو روپیہ

تعارف

اُردو زبان میں ایک صحیح معنی میں اسلامی تاریخ کی ضرورت محسوس ہورہی تھی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اُردو کیا، دوسری زبانوں میں بھی اس کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے، اس لیے کہ ملت جعفریہ کے افراد جو واقعتاً اسلامی روایات کے ورثہ دار ہو سکتے تھے، شروع سے سیاسی طاقتوں کے ظلم و جور کا نشانہ بنے رہے، لہذا اُن کا یہی بہت بڑا کارنامہ تھا کہ انھوں نے عقائد و احکام شرعیہ کو اُن کی اصلی صورت میں محفوظ کر دیا، مگر تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ عموماً اُس طبقہ کی طرف سے تھیں جو حکومتوں کے زیر سایہ پھل پھول رہا تھا، لہذا تاریخ اسلام اپنی اصلی شکل میں سامنے نہیں آسکی۔

شکر ہے کہ سرکار سید العلماء مد ظلہ نے اس ضرورت کی تکمیل کا بیڑا اُٹھایا۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی پیش ہو چکی ہے، جس میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہجرت تک کے واقعات پیش کیے گئے تھے، اب اس سلسلہ کی دوسری کڑی جو ہجرت کے بعد والے ابتدائی دور سے متعلق ہے پیش کی جارہی ہے۔ خدا کرے کہ افراد ملت اس کا بھی شایانِ شان استقبال فرمائیں۔ اور ہم جلد اس کے بقیہ حصص شائع کر سکیں۔

خادم ملت

سید ابن حسین نقوی عفی عنہ

آنریری سکریٹری امامیہ مشن۔ لکھنؤ

محرم سنہ ۱۳۸۵ھ

تاریخ اسلام حصہ دوم

فہرست عناوین

صفحات

صفحات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ
سید الانبیاء والمرسلین وآلہ الطاہرین۔

رسول خدا کا مدینہ میں ورود

اور

آپ کا استقبال

مدینۂ منورہ میں جس کا نام اُس وقت تک یثرب تھا خبر پہونچ چکی تھی کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مکے سے روانہ ہو چکے ہیں، اور یہاں تشریف لانے والے ہیں، اس لئے روزانہ لوگ صبح سویرے بیرون مدینہ جاتے تھے، اور جب دھوپ کی تپش ناقابل برداشت ہو جاتی تھی، تو نا اُمید ہو کر واپس چلے جاتے تھے[1]۔ علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں اور بچے تک ہر روز صبح سے دھوپ کی شدت ہونے تک زیر آسمان انتظار میں کھڑے رہا کرتے تھے[2]۔ چنانچہ

---

[1] طبقات ابن سعد، جلد ۱، ص ۱۵۷ [2] اعلام الوریٰ۔

آخری دن بھی حسب دستور شہر سے باہر دوپہر کے قریب تک انتظار کر چکے تھے اور اب نا اُمید ہو کر واپس ہونا چاہتے تھے، کہ جماعت یہودیوں سے ایک شخص نے جو ایک ٹیلے پر کھڑا تھا، بلند آواز سے کہا کہ جن کا تمھیں انتظار ہے وہ آگیا۔ یہ سنتے ہی سب دوڑ پڑے اور چاروں طرف تکبیر کی صدائیں گونجنے لگیں۔ اُس دن اہل مدینہ کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ عورتیں، بچے اور کنیزیں تک۔ ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں کہ رسول خدا صلعم آگئے، رسول خدا صلعم آگئے[۱] آپ نے وہیں بیرونِ مدینہ قبیلۂ بنو عمرو بن عوف میں قیام فرمایا؛ بقول ابن سعد اس دن دوشنبہ ۱۱ر یا ۱۲ر ربیع الاول کی تاریخ تھی[۲] مسٹر کے۔ اے حمید بیرسٹر لاہور لکھتے ہیں کہ اس دن ۶ر ستمبر ۶۲۲ء تھی[۳] طبری نے معیناً دوشنبہ کی ۱۲ر ربیع الاول لکھی ہے[۴]۔

جائے قیام بیرونِ مدینہ جسے یہ شرف حاصل ہوا کہ آپ اس کے مکان میں فروکش ہوں، اس کے نام میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں قبیلۂ بنی عمرو بن عوف کے ایک بزرگ کلثوم ابن ہدم کے یہاں قیام ہوا تھا، اور بعض کہتے ہیں کہ سعد بن خیثمہ کے یہاں۔ پہلے قول کے حامیوں کا کہنا ہے کہ حضرت کا قیام تو کلثوم بن ہدم ہی کے یہاں تھا، مگر چونکہ سعد بن خیثمہ شادی شدہ نہ تھے، ان کا مکان بالکل مردانہ تھا اس لئے آپ لوگوں سے ملاقات کے لئے دن کو اُن کے مکان میں تشریف فرماتے تھے۔

---

[۱] ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۱۵۸ — [۲] طبقات جلد ۱ صفحہ ۱۵۰

[۳] مسلمانانِ عالم صفحہ ۹۶ — [۴] طبری جلد دوم صفحہ ۲۴۹

اس سے کچھ لوگ یہ سمجھے کہ آپ کا قیام سعد بن خثیمہ ہی کے یہاں ہے۔[1]

بھائی کا انتظار حضرت علی ابن ابی طالبؑ، پیغمبر خداؐ کے چچا زاد بھائی ہی نہ تھے، بلکہ ابتدائے عمر سے آپ کے زیر سایہ پرورش پانے کی وجہ سے اولاد کی سی نسبت آپ سے رکھتے تھے بلند نفوس کے لیے خود اپنے کو خطرے میں ڈال دینا اتنا دشوار نہیں ہوتا، جتنا جان سے زیادہ عزیز افراد کو خطرے میں ڈالنا۔ یہ تو دین حق کی خاطر اور حکم الٰہی کی تعمیل میں ایک بڑی قربانی تھی، جو رسول خداؐ، علی بن ابی طالبؑ کو اپنے بستر پر دشمنوں کے محاصرہ میں چھوڑ کر روانہ ہوگئے۔ مانا کہ جب آپ مکہ کے غار میں پناہ گزیں تھے، تو وہیں آپ کو اس رات کے خطرے سے علیؑ کی سلامتی کا حال معلوم ہوگیا تھا، مگر آپ کے تشریف لے جانے سے کفار کو جو اشتعال تھا، اور ایک طرح اپنی شکست کا غصہ، جس شکست میں خود علی ابن ابی طالبؑ نے بستر پر سو کے ایک بڑا عملی حصہ بھی لیا تھا، اس لیے ظاہری اسباب کی بنا پر علیؑ کا مکہ میں جتنے دن بھی قیام رہا، اُس کا ایک لمحہ بھی خطرے سے خالی نہ تھا، لہٰذا فطری طور پر پیغمبرؐ کو علیؑ کی فکر ہونا چاہیے تھی۔ پھر یہ کہ آپ مکہ میں اپنی انتہائی محترم اور مقدس امانتیں بھی علیؑ ہی کی ذمہ داری پر چھوڑ آئے تھے۔ یہ خاندان کی محترم خواتین تھیں، جن میں خود جناب پیغمبر خداؐ کی اکلوتی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ بھی تھیں اور ان کے علاوہ جن کے نام معلوم ہیں ایک رسولؐ کی چچی جناب فاطمہ بنت اسد،

---

[1] طبری مطبع حسینیہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۴۸

یعنی حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی والدہ تھیں، اور دوسرے پیغمبرؐ کی چچازاد بہن فاطمہ بنت زبیر بن عبد المطلب تھیں۔ ان خواتین کا مدینہ آنا حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے وابستہ تھا۔ اسی لیے پیغمبر خداؐ جب قبا میں فروکش ہوئے، تو باوجودیکہ آپ کے رفیق سفر ابوبکرؓ اسی دن آپ کو چھوڑ کر داخل شہر ہوگئے اور جاکر قبیلہ خزرج کے ایک شخص حبیب بن اساف، یا خارجہ بن زید بن ابی زہیر کے یہاں مقیم ہوگئے[۱]، لیکن حضرت پیغمبر خداؐ نے مدینہ کے داخل ہونے کو ان افراد کے پہونچ جانے پر موقوف رکھا، تاکہ سب لوگ ایک ساتھ دارالہجرت میں داخل ہوں۔

ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ حضرتؐ نے وہاں چودہ دن قیام فرمایا[۲]۔ اس دوران میں ایک قول کے مطابق آپؐ کے ورود مدینہ کے تین دن کے بعد حضرت علی ابن ابی طالبؑ بھی آپ تک پہونچ گئے۔ شاہ عبد الحق دہلوی نے اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے :-

"دریں ہم دراںجا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بتقاریب سہ روزہ از مکہ در رسید آنحضرتؐ را خوشحال کردانید و در روضۃ الاحباب می گوید کہ وے رضی اللہ عنہ پیادہ راہ می رفت و پاہائے مبارک وے از پیادہ رفتن آبلہ کردہ بود حضرتؐ دست مبارک خویش برآں مالید و در زماں صحت یافت۔ انتہیٰ، وایں مثل آں سیت کہ در غزوہ خیبر چشم وے رضی اللہ عنہ درد می کرد آنحضرتؐ لعاب مبارک خود مالید در حال شفا یافت و ہرگز در چشم نہ دید[۳]۔"

---

[۱] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۹ [۲] طبقات جلد ۱ صفحہ ۱۵۹ [۳] مدارج النبوۃ

(ترجمہ) تین روز بعد علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی مکہ سے وہاں پہونچ گئے اور آنحضرتؐ کو شادکام کیا۔ صاحب روضۃ الاحباب لکھتے ہیں کہ آپ (حضرت علیؑ) نے پا پیادہ سفر کیا تھا جس سے آپ کے پائے مبارک میں چھالے پڑ گئے تھے آنحضرتؐ نے اپنا دست مبارک پھیرا جس سے فوراً صحت ہو گئی، یہ بالکل اسی طرح کا واقعہ ہے کہ غزوہ خیبر میں آپ (حضرت علیؑ) درد چشم میں مبتلا تھے آنحضرتؐ نے اپنا لعاب مبارک لگایا جس سے فوراً صحت ہو گئی اور پھر کبھی آنکھیں دکھنے نہیں آئیں۔"

مگر ہمیں محدث دہلوی کے اس بیان سے کہ حضرت علی ابن ابی طالبؓ حضرتؐ کے تین دن بعد پہونچ گئے تھے خاطر جمعی نہیں ہوتی، اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو مزید دس بارہ دن بیرون مدینہ قیام کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے خیال میں یہ تین دن کا قیاس اس پر مبنی ہے، کہ مورخ ابن جریرلہ نے تصریح کی ہے کہ حضرت علیؓ نے مکہ میں رسولؐ کے تشریف لے جانے کے بعد تین دن قیام فرمایا، جس میں آپ نے وہ امانتیں جو پیغمبرؐ کے پاس تھیں اُن کے مالکوں تک پہونچائیں، اس کے بعد آپ پیغمبر خداؐ کے پاس آئے اور حضرتؐ کے جائے قیام یعنی کلثوم بن ہدم کے مکان پر آپ کے ساتھ قیام فرمایا۔ مگر مدینہ میں رسولؐ کے بعد تین دن قیام کرنے سے یہ قطعاً نتیجہ نہیں نکلتا، کہ آپ رسولؐ کے پاس تین دن کے بعد پہونچ گئے ہوں گے، جب کہ پیغمبرؐ تنہا سفر فرما رہے تھے، اور آپ کے ساتھ عورتیں تھیں، اس لئے

لہ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۹

آپ کے سفر کی رفتار پیغمبرؐ کی رفتار سفر کے برابر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ پیغمبرؐ نے جتنے دن میں وہ راستہ طے فرمایا ہو، آپ نے اُس سے کافی زیادہ دنوں میں اس مسافت کو طے کیا ہو، اور اس طرح تین دن بعد نہیں بلکہ اس سے کافی زیادہ دیر میں پہونچے ہوں، اور اس لئے ہمارے نزدیک اس سے زیادہ قرین قیاس علامہ طبرسی کا بیان ہے، جنھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم جب بیرون مدینہ فروکش ہوئے تو آپ کے رفیق سفر ابو بکر اُسی دن شام کو مدینہ میں چلے گئے، اور انصار میں سے ایک کے یہاں قیام کیا، اور رسالت مآبؐ پندرہ دن تک وہیں شہر کے باہر مقیم رہے۔ شاید کچھ اہل مدینہ کے اصرار سے جناب ابو بکر نے حضرتؐ کے پاس آکر کہا کہ اب آپ شہر مدینہ میں کیوں داخل نہیں ہوتے؟ لوگ آپ کے وہاں تشریف لے جانے کے بہت مشتاق ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ جب تک میرا بھائی علیؑ نہ آجائے میں اس جگہ سے آگے نہیں بڑھوں گا، یہ سن کر حضرت ابو بکر نے مایوسی کے انداز میں کہا کہ مجھے تو نہیں اُمید کہ علیؑ آئیں۔ حضرتؐ نے فرمایا کیوں نہیں انشاء اللہ وہ بہت جلد آئیں گے۔ چنانچہ پانچ دن آپ وہاں اور رہے، اور اس دوران میں حضرت علیؑ خواتین کو ساتھ لیے ہوئے آپ کے پاس پہونچے[۵]۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کے پہونچنے کے بعد پھر رسولؐ نے

---

[۵] اعلام الوریٰ۔

قبا میں زیادہ قیام نہیں فرمایا، اور اس طرح یہ بات کہ حضرت علیؑ رسولؐ کے پہونچنے سے تین دن کے بعد پہونچ گئے تھے غلط ہے، یا پھر جیسا کہ طبری کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے خود رسولؐ کا قیام قبا میں چار پانچ دن سے زیادہ نہیں رہا چنانچہ لکھا ہے :۔

فاقام رسول اللهؐ بقباء فی بنی عمرو بن عوف یوم الاثنین ویوم الثلاثاء ویوم الاربعاء ویوم الخمیس ثم اخرجه الله عزوجل من بین اظهرهم یوم الجمعة

حضرت کا قیام وہاں دوشنبہ، سہ شنبہ، چہارشنبہ اور پنجشنبہ کو رہا اور بس جمعہ کو آپ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

آخر میں لکھا ہے کہ وہ زیادہ دن کے قیام کی روایت بنی عمرو بن عوف کے ذریعہ سے پھیلی ہے، شاید اس لیے کہ ان کے فخر و شرف میں اضافہ ہو۔ طبری کے الفاظ یہ ہیں کہ بنو عمرو بن عوف یزعمون انه مکث فیهم اکثر من ذالك ـــــ ویقول بعضهم ان مقامه بقباء کان بضعة عشر یوما[۱] اس میں دس دن یا اس سے زیادہ قیام کو بنی عمرو بن عوف کی طرف "زعم" کے لفظ سے منسوب کیا ہے جس کے معنی عموماً "ادعائے باطل" کے ہوتے ہیں۔ مصالحتی وہم کا آغاز، یثرب کے باشندوں میں دو بڑے قبیلے تھے

---

[۱] تاریخ طبری جلد ۲ صـ۲۴۹

اوس اور خزرج، ان میں باہم جنگ رہتی تھی۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مدینہ میں تشریف لا کر قیام کا ایک بڑا خوشگوار نتیجہ یہ سامنے آیا کہ یہ دونوں قبیلے آپس میں گلے مل گئے۔ اس فیض رسالت کا تذکرہ بطور احسان خداوندی قرآن مجید میں بھی آیا ہے، کہ کنتم اعداءً فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانًا (یعنی) تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اُس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی ہو گئے۔ اس مہم کا آغاز اُن ہی چند دنوں میں ہو گیا، جب رسول بیرون مدینہ قیام پذیر تھے۔ علامہ طبرسی لکھتے ہیں، کہ آپ کا قیام بنی عمرو بن عوف کے ایک نیک مرد بیر کلثوم بن ہدم کے مکان پر تھا، جو نابینا ہو چکے تھے اور قبیلہ اوس کے افراد آپ کے گرد و پیش آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ پیغمبر خدا آنے والوں کے چہروں کو غور سے ملاحظہ فرماتے تھے؛ تو ان میں خزرج کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا، حالانکہ اُن وفد میں جو مدینہ سے آپ کے پاس مکہ گئے تھے، خزرج کے ممتاز افراد بھی تھے۔ حضرتؐ اس کو محسوس فرماتے تھے، مگر کچھ فرماتے نہ تھے۔ جب چند دن آپ کے قیام کو وہاں گزر گئے تو ایک دن نماز عشاء کے بعد اسعد بن زرارہ چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے آئے اور پیغمبر کو سلام کیا۔ حضرتؐ اُن کے آنے سے بہت خوش ہوئے، اور شاید سبب تاخیر پوچھا۔ اُنھوں نے کہا یا رسول اللہ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا تھا کہ میں آپ کی موجودگی کو اس قرب و جوار میں کسی جگہ سنوں اور بیٹھا رہوں، مگر ہم میں، اور ہمارے اوسی بھائیوں میں جو

نزاع ہے، وہ آپ کو معلوم ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی کے گھر پر آنا میں پسند نہ کرتا تھا، مگر اس وقت مجھے تاب صبر باقی نہ رہی اور بے تابانہ آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہو گیا۔ قبیلۂ خزرج کے ایک نمایاں شخص کی اس پیش قدمی سے آپ کو موقع مل گیا، کہ آپ آئندہ کی صلح کے لیے زمین ہموار فرمائیں۔ آپ نے اوس والوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جو انھیں پناہ دے۔ مطلب یہ تھا کہ ان کی جان و مال کی حفاظت کا جب کہ یہ تمہارے درمیان آئے ہیں، کون ذمہ دار ہوتا ہے؟ اوس کے تمام آدمی جو حاضر تھے چیخ اٹھے کہ حضورؐ کا پناہ دینا ہمارا پناہ دینا ہے، آپ نے فرمایا نہیں، صاف صاف تم میں سے کوئی ایک ذمہ دار ہو۔ یہ سن کر عویم بن ساعدہ اور سعد بن خثیمہ نے کہا کہ یارسول اللہ ہم انھیں پناہ دیتے ہیں، چنانچہ وہ اُن کی حفاظت کے ذمہ دار ہو گئے، اور اب وہ وقتاً فوقتاً رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے، اور آپ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، اور قبیلۂ اوس میں سے کسی جوان یا بچے کی بھی یہ ہمت نہ تھی کہ وہ اشارہ و کنایہ سے بھی انھیں کوئی تکلیف پہونچائے۔ ممکن ہے کہ اسعد کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگ بھی خزرج کے آنے لگے ہوں مگر تاریخ میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ پھر بھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ پہلا ہی قدم اُن کے درمیان مصالحت کا جو حضرتؐ نے کامیابی کے ساتھ اٹھایا، اُن میں تعلقات محبت کی بحالی اور آئندہ کی مستقل مصالحت کا سنگ بنیاد بن گیا۔

مسجد قبا اس میں کوئی شک نہیں کہ بیرون مدینہ جس محلہ میں حضرتؐ کا قیام ہوا تھا، اور جہاں بنی عمرو بن عوف کے مکانات تھے، اسی محلہ میں مسجد قبا کی تعمیر ہوئی ہے، مگر یہ مسجد کب تعمیر ہوئی؟ محدث دہلوی شاہ عبدالحق نے یہ محتاط الفاظ صرف کیے ہیں کہ:-

"اول وصول و نزول آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم در منازل بنی عمرو بن عوف بود کہ مسجد قبا در آنجا بنا یافتہ است[1]"

(ترجمہ) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ورود و قیام پہلے بنی عمرو بن عوف کے محلہ میں ہوا جہاں مسجد قبا تعمیر کی گئی۔

لیکن علامہ طبرسی کے الفاظ یہ ہیں:-

فوافی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وقصد مسجد قبا ونزل واجتمع الیہ بنو عمرو بن عوف وسروا بہ واستبشروا واجتمعوا حولہ ونزل علی کلثوم بن الہدم[2]۔	رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ پہونچے اور آپ نے مسجد قبا کا رُخ کیا اور وہاں اُتر پڑے اور بنی عمرو بن عوف آپ کے پاس جمع ہو گئے اور وہ بہت خوش ہوئے اور آپ کے گرد حلقہ کر لیا اور آپ نے کلثوم بن ہدم کے یہاں قیام فرمایا۔

ان الفاظ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ مسجد قبا پہلے سے موجود تھی، اور مدینہ کے باہر ورود کے وقت آپ اپنی سواری سے سب سے پہلے وہیں اُترے،

---

[1] مدارج النبوۃ۔ [2] اعلام الوریٰ۔

پھر کلثوم بن ہدم کے یہاں جا کر قیام فرمایا۔ مگر مورخ کبیر کی تصریح یہ ہے کہ رسول خداؐ نے قبا میں دوشنبہ، سہ شنبہ، چہار شنبہ اور روز پنجشنبہ قیام فرمایا۔ "واسس مسجدھم" اور اُن کی مسجد کی بنیاد رکھی ¹۵ پھر روز جمعہ آپ وہاں سے روانہ ہوئے ¹۵۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ یہی عظیم مورخ آگے چل کر مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد رقم طراز ہے:—

وفی ھذہ السنۃ بنی مسجد قبا — اسی سال میں مسجد قبا بنائی گئی ¹۵۔

ہو سکتا ہے کہ ان دونوں باتوں کا مطلب یہ ہو کہ نیو اُن چند دنوں میں ڈال دی گئی تھی اور تعمیر مسجد کی اس کے بعد دوران سال میں ہوئی، ورنہ میں اسے "خطائے بزرگاں" کا ایک نمونہ بس سمجھ سکتا ہوں اور کیا کہا جائے۔

مدینے کے اندر داخلہ } قبا کے چند روزہ قیام کے بعد جس پر پہلے روشنی ڈالی جا چکی ہے، جمعہ کا دن تھا، صبح کو جب دھوپ چڑھ گئی تھی تو حضرتؐ نے اپنی سواری منگوائی اور تمام مسلمان جمع ہوئے اور مسلح ہو گئے، پھر رسولؐ ناقے پر سوار ہوئے اور لوگ دائیں بائیں آپ کے روانہ ہوئے، مدینہ کے رہنے والوں کو بھی اس کا علم ہو گیا۔ لوگ اپنے گھروں کے باہر نکل آئے، اور انصار کے قبیلوں اور خاندانوں میں سے جن کے مکانات کی طرف سے آپ کا گزر ہوتا تھا، وہ آگے بڑھ کے درخواست کرتے تھے، کہ حضورؐ ہمارے یہاں قیام فرمائیں۔ مجسم خلق عظیم کو کسی کی خاطر شکنی گوارا نہ تھی،

---

¹۵ تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۴۹ — ¹۵ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۶

ہر ایک کو دعائے خیر دیتے تھے، اور فرماتے تھے، چھوڑ دو اسے: قدرت کی جانب سے جہاں حکم ہوگا وہیں یہ مجھے پہونچا دے گا۔ یہ سُن کر ہر ایک خاموش ہو جاتا تھا اور ناقہ آگے بڑھ جاتا تھا۔

مدینہ میں پہلی نمازِ جمعہ اور رسولؐ کا پہلا خطبہ

اثنائے راہ میں جب زوالِ آفتاب کا وقت آیا تو حضرتؐ اس وقت قبیلہ بنی سالم کے درمیان تھے۔ مثل راستے کے تمام لوگوں کے، انھوں نے بھی حضرتؐ کے سامنے قیام کی پیش کش کی جس پر حضرتؐ خاموش رہے، مگر آپؐ کا ناقہ ان کی مسجد کے پاس بیٹھ گیا۔ علامہ طبرسی نے صراحۃً لکھا ہے:-

وقد کانوا بنوا مسجداً قبل قدوم رسول اللہ۔ — یہ لوگ رسولؐ کے آنے سے پہلے ایک مسجد کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔

ناقے کا اس مسجد کے پاس بیٹھنا قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ نماز جمعہ آج یہیں ہو گی، چنانچہ حضرتؐ نے ظہر کے وقت نماز وہیں ادا فرمائی۔ علامہ طبری کا بیان اُن سے اس جز میں مختلف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسجد وہاں پہلے سے موجود نہ تھی بلکہ اس کے بعد وہاں پر مسجد کی تعمیر ہوئی۔

مسٹر کے۔ اے حمید لکھتے ہیں کہ ۱۲ ربیع الاول سلھ کو رسول خدا نے ایک سو مسلمانوں کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا کی، اور وہ خطبہ جو اس موقع پر

۱؎ اعلام الوریٰ۔ ۲؎ طبری جلد ۲ ص ۲۵۲

پڑھا، دنیا کی تاریخ میں ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہے۔ مگر اتنی اہم تقریر جو صوت نے کاٹ چھانٹ کر کل چھ آٹھ سطروں میں درج کی ہے ہم اس مکمل تقریر کو جو کافی بسیط ہے حافظ ابن جریر کی روایت کے مطابق درج کرتے ہیں :-

الحمد للہ احمدہ و استعینہ و استغفرہ و استھدیہ و اومن بہ ولا اکفرہ و اعادی من یکفرہ و اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ و ان محمدا عبدہ و رسولہ ارسلہ بالھدیٰ والنور والموعظۃ علیٰ فترۃ من الرسل وقلۃ من العلم وضلالۃ من الناس و انقطاع من الزمان ودنو من الساعۃ وقرب من الاجل من یطع اللہ و

سب تعریف اللہ کے لئے ہے۔ میں اُس کی تعریف کرتا ہوں اور اس سے مدد مانگتا ہوں، اور اُسی سے بخشش کا طلب گار ہوں اور اُس سے ہدایت کا خواہاں ہوں اور اس پر ایمان لاتا ہوں اور اُس کا انکار نہیں کرتا اور دشمن ہوں اُس کا جو اُس کا انکار کرے، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی خدا نہیں سوا اللہ کے کوئی اُس کا شریک نہیں اور یہ کہ محمد اُس کا بندہ اور اُس کا رسول ہے جسے اُس نے بھیجا ہے ہدایت اور نور اور وعظ و نصیحت کے ساتھ ایسے وقت میں جب کہ رسولوں کا سلسلہ موقوف تھا اور علم کی کمی تھی اور لوگوں میں گمراہی پھیلی ہوئی تھی اور زمانہ دور ہو گیا تھا اور قیامت قریب تھی اور موت نزدیک تھی

(حاشیہ پر دستی تحریر: [illegible])

سلہ مسلمانانِ عالم ملک -

رسوله فقد رشد و
من يعصهما فقد غوى
وفرّط وضلّ ضلالاً بعيدا
واوصيكم بتقوى الله فانه
خير ما اوصى به المسلم
المسلم ان يحضّه على
الآخرة وان يأمره
بتقوى الله فاحذروا
ما حذّركم الله من نفسه
ولا افضل من ذلك
نصيحة ولا افضل من
ذلك ذكرا وان تقوى الله
لمن عمل به على وجل ومخافة
من ربه عون صدق على ما
تبتغون من امر الآخرة ومن
يصلح الذى بينه وبين الله من
امره فى السر والعلانية لا
ينوى بذلك الا وجه الله
يكن له ذكرا فى عاجل امره

اُس کے رسول کی اطاعت کرے وہ راہ
راست پر ہے، اور جو ان دونوں کی نافرمانی
کرے وہ گمراہ ہوا اور وہ تقصیر وار اور بھٹکا
ہوا ہے بہت زیادہ۔ اور میں تمہیں نصیحت
کرتا ہوں اللہ کے غضب سے بچنے کی کہ بہترین
وہ شے جس کی نصیحت کرے ایک مسلمان
دوسرے مسلمان کو یہ ہے کہ وہ اُسے آخرت کی
تیاری پر آمادہ کرے اور اللہ سے ڈرنے کی
ہدایت کرے، اور ڈرو اللہ سے جتنا اُس نے
اپنے سے ڈرایا ہے، اور اس سے بڑھ کے کوئی
نصیحت نہیں ہے، اور نہ اس سے بہتر کوئی
یاد ہے، اور یقیناً اللہ سے پرہیزگاری اُن کے
لئے جو اس کے مطابق عمل کرے خوف و
دہشت کے ساتھ اپنے پروردگار کی عظمت سے
بہترین مددگار ہے اُس منزل مقصد پر جو کہ
آخرت ہے اور جو ان روابط کو جو ظاہر و باطن
میں اُس کے اور اللہ کے درمیان ہیں درست
رکھے اور سوا رضائے الٰہی کے کوئی اور مقصد
نہ ہو تو وہ اُس کے لئے دنیا میں نیک نامی

وذخرا فیما بعد الموت حین
یفتقر المرء الی ما قدم وما
کان معه سوی ذلک یود
لو ان بینه وبینه امدا بعیدا
ویحذرکم الله نفسه والله
رؤف بالعباد والذی صدق
قوله وینجز وعده ولا خلف
لذلک فانه یقول عزوجل
ما یبدل القول لدی
وما انا بظلام للعبید
فاتقوا الله فی عاجل
امرکم واجله فی
السر والعلانیة
فانه من یتق الله
یکفر عنه سیاته
ویعظم له اجرا ومن
یتق الله فقد فاز
فوزا عظیما و
ان تقوی الله

اور بعد مرگ کے لیے ذخیرہ ہوگا جب انسان
محتاج ہوگا اپنے بھیجے کیے ہوئے
اعمال کا اور سوا اس کے کچھ اس کے
ساتھ نہ ہوگا۔ وہ آرزو رکھے گا کہ کاش
اس کے اور اس موقعہ کے درمیان بہت
بڑا فاصلہ ہوتا اور اللہ تمہیں اپنے سے
ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر شفیق و مہربان
ہے اور اس نے اپنی بات کو سچ کر دکھایا
اور اپنے وعدے کو پورا کیا اور اس کے
خلاف نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ خود
فرماتا ہے کہ میرے یہاں بات بدلتی
نہیں اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا
نہیں ہوں تو اللہ سے ڈرو اپنی دنیا اور
آخرت دونوں میں اور ظاہر و باطن میں
اس لیے کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے تو وہ
اس کی غلطیوں کو نظر انداز کرتا اور اس کے
اجر و ثواب کو بڑھاتا ہے اور جو اللہ
سے ڈرتا ہے اس نے بڑی کامیابی
حاصل کی اور یقیناً اللہ سے ڈرنا

یوتی منتہ و یوتی
عقوبتہ و یوتی سخطہ
وان تقوی اللہ یبیّض
الوجوہ و یرضی الرب
و یرفع الدرجة خذوا
بحظکم ولا تفرّطوا
فی جنب اللہ قد علمکم
اللہ کتابہ و نہج لکم
سبیلہ لیعلم الذین
صدقوا و یعلم الکاذبین
فاحسنوا کما احسن
اللہ الیکم و عادوا
اعداءہ و جاھدوا
فی اللہ حق جہادہ
ھو اجتباکم و سمّاکم
المسلمین لیھلک
من ھلک عن
بیّنة و یحیی من
حیّ عن بیّنة

اُس کی ناراضگی سے بچاتا ہے اور اُس کی
سزا سے بچاتا ہے اور اُس کے غضب سے
بچاتا ہے اور یقیناً اللہ سے ڈر چہروں
کو نورانی بناتا اور پروردگار کو راضی
کرتا اور درجے کو بلند کرتا ہے اپنا
حصہ حاصل کرو اور اللہ کے بارے
میں کوتاہی سے کام نہ لو حالانکہ اللہ
نے تم کو اپنی کتاب کا علم دیا ہے
اور تمھارے لئے اپنا راستہ صاف
نمایاں کر دیا ہے تاکہ وہ جانے انھیں
جو سچے ہیں اور جانے انھیں جو جھوٹے
ہیں۔ تو حسن سلوک سے کام لو جس طرح
اللہ نے تمھارے ساتھ اچھا سلوک
کیا ہے اور اُس کے دشمنوں کو دشمن
رکھو اور اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا
کرو اُس نے تمھیں منتخب کیا اور تمھارا
نام "مسلم" رکھا، تاکہ جو ہلاک ہو وہ
حجت تمام ہونے کے بعد ہلاک ہو
اور جو زندگی پائے وہ کسی حجت کی

ولا قوۃ الا باللہ فاذکروا | بنا پر زندگی پاک ہے اور قوت نہیں ہے
ذکروا اللہ واعملوا | مگر اللہ کے سہارے سے تو اللہ کو بہت
لما بعد الیوم فانہ | یاد کرو اور آج کے بعد والے دن کے
من یصلح ما بینہ و | واسطے کام کرو کہ جو شخص اُس معاملہ کو
بین اللہ یکفہ اللہ ما | جو اُس کے اور اللہ کے درمیان ہے
بینہ و بین الناس | ٹھیک رکھے گا تو اللہ اس کے اور دوسرے
ذلک بان اللہ یقضی | لوگوں کے درمیان والے معاملے کو خود ہی
علی الناس ولا یقضون | ٹھیک کر دے گا اس لئے کہ اللہ لوگوں پر
علیہ و یملک من | فیصلہ نافذ کرنے والا ہے اور وہ اُس پر
الناس ولا یملکون | فیصلہ نافذ نہیں کر سکتے اور وہ لوگوں کا
منہ اللہ اکبر ولا | مالک ہے وہ اس کے مالک نہیں ہیں اللہ
قوۃ الا باللہ | سب سے بڑا ہے اور نہیں قوت مگر اللہ کے
العظیم۔ | سہارے جو بزرگ ہے۔

ابوایوب انصاری کے یہاں قیام

نماز اور خطبہ کے بعد پھر حضرت ناقے پر سوار ہوئے، ناقہ روانہ ہوا اور پھر راستے کے لوگوں کی طرف سے جب قیام پر اصرار ہوا تو آپ نے فرما دیا کہ بس اسی ناقے پر چھوڑ دو! جہاں جاکر رک جائے گا وہیں میں اُتر پڑوں گا۔ چنانچہ وہ چلا اور آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ

لہ تاریخ الامم والملوک لابی جعفر محمد بن جریر الطبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۵ و ۲۵۶۔

اُس جگہ پہونچا جہاں مسجد نبوی ہے اور یہاں پہونچ کر وہ اک دم بیٹھ گیا۔ خوش نصیبی سے یہ جگہ ابو ایوب انصاری کے مکان کے قریب تھی۔ وہ خوش خوش آئے اور آپ کا سامان اُٹھا کے اپنے مکان کے اندر لے گئے پھر آس پاس کے دوسرے آدمیوں نے آکر اصرار شروع کیا۔ حضرت نے بطور ضرب المثل کے یہ جملہ فرمایا کہ اَلْمَرْءُ مَعَ رَحْلِهٖ یعنی جہاں آدمی کا سامان وہیں وہ آدمی۔ ؎

علامہ طبری لکھتے ہیں :-

یہ مسجد نبوی کی جگہ جہاں آپ کی ناقہ آکر بیٹھا تھا قبیلہ خزرج کے دو یتیموں کی زمین تھی جن کے نام سہل و سہیل تھے۔ اور یہ دونوں یتیم اسعد بن زرارہ کی پرورش میں تھے۔ یہ جگہ ابو ایوب کے دروازے پر تھی اور ابو ایوب کی والدہ آپ کا سامان اونٹ پر سے اُتار کر اپنے گھر میں لے گئیں۔ تو جب لوگوں نے حضرت سے اصرار کیا کہ ہمارے یہاں چلیئے تو آپ نے اپنا سامان دیکھا اور وہ موجود نہ ملا تو دریافت کیا۔ تب حضرت کو بتایا گیا کہ وہ تو ابو ایوب کی والدہ اپنے مکان میں لے گئیں۔ اس پر حضرت نے فرمایا المرء مع رحلہ اور اسعد بن زرارہ حضرت کے خالی ناقہ کی مہار تھام کر اپنے مکان پر لے گئے۔ ؎

سلہ طبقات ابن سعد، جلد ا صفحہ ۱۶۰

سلہ اعلام الوریٰ۔

ہجرت کی تاریخی اہمیت

جیسا کہ فاضل ہم عصر حبیب ریحان ندوی مقیم مصر نے لکھا ہے
صدر اول کے مسلمانوں کی نظر میں واقعۂ ہجرت کی تاریخی اہمیت کا
بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسلامی سال کا حساب ہجرت نبوی ہی سے کیا گیا
ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفۂ دوم حضرت عمر کی خلافت کو تقریباً چار سال
گزر چکے تھے یعنی ہجرت کا سولھواں سال تھا جب یہ سال ہجری مقرر
کیا گیا۔ اس واقعہ کی ابتدا مقریزی جلد اول میں اس طرح درج ہے کہ
حضرت عمر کے سامنے ایک چک پیش ہوا جس پر صرف شعبان لکھا ہوا تھا
حضرت عمر نے کہا کہ یہ کس طرح معلوم ہو کہ یہ کس سال کا ماہ شعبان ہے
اس کے لئے فوراً مجلس شوریٰ مرتب کی گئی اور اکابر صحابہ کے سامنے
یہ مسئلہ پیش ہوا حضرت علی بن ابی طالب نے رائے دی کہ ہجرت نبوی
سے سنہ شروع کیا جانا چاہیے۔ اس پر سب کا اتفاق ہو گیا۔[1]

چونکہ عرب میں نیا سال محرم سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت
ربیع الاول میں ہوئی تھی اس لئے سال کو تقریباً دو ماہ پیچھے ہٹا کر
اس کی ابتدا محرم ہی سے رکھی گئی۔

شہرت عام اسی کے مطابق ہے کہ ہجرت سے تاریخ کے حساب کا
آغاز عہد خلیفۂ دوم میں ہوا ہے مگر حافظ ابن جریر نے بطور اپنے مختار کے

---

[1] سہ روزہ دعوت دہلی، سیرت طیبہ نمبر ۱۲ ستمبر ۱۹۵۹ء ص ۲۱۵-۲۱۶۔

یہ روایت درج کی ہے کہ یہ ہجرت سے تاریخ کا تعین ہجرت کے بعد ہی سے بحکم رسول خداؐ شروع ہوا، چنانچہ اُنھوں نے پہلے سُرخی قائم کی ہے "ذکر الوقت الذی عمل فیہ التاریخ" اس وقت کا ذکر جس میں تاریخ کا تعین عمل میں آیا ہے۔ اس کے تحت میں لکھا ہے :۔

قال ابو جعفر ولما قدم رسول اللہؐ المدینۃ امر بالتاریخ۔ حدثنی زکریا بن یحییٰ بن ابی زائدۃ قال حدثنا ابو عاصم عن ابن جریج عن ابی سلمۃ عن ابن شہاب ان النبیؐ لما قدم المدینۃ وقدمہا فی شہر ربیع الاول امر بالتاریخ قال ابو جعفر فذکر انہم کانوا یؤرخون بالشہر والشہرین الیٰ ان تمت السنۃ۔

ابو جعفر (طبری) کہتے ہیں اور جب رسول خداؐ مدینہ میں تشریف لائے تو آپ نے تاریخ کے تقرر کا حکم دیا، مجھ سے بیان کیا زکریا بن یحییٰ بن ابی زائدہ نے، کہا کہ ہم سے بیان کیا ابو عاصم نے ابن جریج سے انھوں نے ابو سلمہ سے، انھوں نے ابن شہاب سے کہ رسول جب مدینہ میں تشریف لائے اور آپ وہاں ماہ ربیع الاول میں آئے تھے تو آپ نے تاریخ مقرر کرنے کا حکم دیا، تو بیان کیا گیا ہے کہ صحابہ ایک مہینہ اور دو مہینے کے حساب سے تاریخ لکھنے لگے یہاں تک کہ سال پورا ہوا۔

اس کے بعد انھوں نے خلیفۂ دوم کے دور میں آغاز تاریخ کو بطور قول ضعیف یوں درج کیا ہے :-

وقد قیل ان اول من امر — ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے جس نے
بالتاریخ فی الاسلام — تاریخ کے تعین کا حکم دیا اسلام میں وہ
عمر بن الخطابؓ۔ — عمر بن خطاب ہیں۔

درایۃً پہلے قول کو اس لئے ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ بہت بعید ہے کہ روزمرہ کی اتنی اہم ضرورت کا احساس رسولؐ اور تمام مسلمانوں کو اور خلیفۂ اول اور بلکہ بہت عرصہ تک خلیفۂ دوم کو کبھی نہ ہوا ہو اور اتنی مدت گزرنے کے بعد ایک دم اس ضرورت کا احساس پیدا ہوا ہو۔

مسجد نبوی کی تعمیر

پہلے ایک روایت کے مطابق لکھا گیا ہے کہ ابوایوب انصاری کے مکان کے پاس یہ احاطہ جس میں مسجد نبوی ہے قبیلۂ خزرج کے دو یتیموں کی ملکیت میں تھا جو اسعد بن زرارہ کی زیر پرورش تھے۔ خود اسعد کا تذکرہ پہلے آچکا ہے کہ یہ اُن سابق الایمان افراد میں تھے جو رسولؐ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے ہی شمع ایمان کے پروانہ ہوچکے تھے، اس لیے پیغمبرؐ نے ابوایوب کے مکان میں قیام کے بعد نماز جماعت کا سلسلہ اسی احاطہ میں جاری رکھا۔ کچھ دن کے

؎ طبری جلد ۲ صہ ۲۵۲ ۔

بعد حضرتؐ نے چاہا کہ وہاں باقاعدہ مسجد کی تعمیر ہو جائے۔ آپ نے اسعد بن زرارہ سے فرمایا کہ تم یہ زمین میرے لئے اس کے مالکوں سے خرید دو۔ انھوں نے یتیموں سے گفتگو کے بعد کہا کہ وہ حضورؐ کی خدمت میں نذر کی جاتی ہے، قیمت کی ضرورت نہیں، مگر حضرتؐ نے اُسے بلامعاوضہ لینے سے انکار کیا، چنانچہ دس دینار کی قیمت پر آپ نے زمین خرید فرمائی۔

طبری کا بیان ہے کہ وہ دونوں یتیم معاذ بن عفراء کے سایۂ تربیت میں تھے، اور معاذ بن عفراء ہی کے ذریعہ یہ زمین حاصل ہوئی۔ پھر اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک زیادہ صحیح روایت یہ ہے، کہ یہ زمین بنی نجار کی تھی، اور یہاں کچھ کھجور کے درخت اور کھیت، اور کچھ زمانۂ جاہلیت کے قبور تھے۔ حضرتؐ نے اُن سے فرمایا کہ مجھ سے اس زمین کی قیمت لے لو، اُنھوں نے کہا ہم سوا رضائے پروردگار کے کوئی قیمت نہیں چاہتے۔ حضرتؐ نے اس پیش کش کو قبول فرما لیا۔ درخت کٹوا دیے، کھیت ختم کرا دیے، اور قبروں کو اُکھڑوا کر صاف کرا دیا۔ اور پھر یہاں مسجد تعمیر فرمائی۔ اس کے پہلے آپ کسی متعین جگہ پر نماز نہیں پڑھتے تھے، بلکہ مختلف مقامات پر جہاں نماز کا وقت آ گیا، وہاں نماز پڑھ لیتے تھے۔

سلہ اعلام الوری۔ سلہ طبری ج ۲ صہ ۲۵۶

مسٹر کے۔ اے حمید لکھتے ہیں کہ سب سے پہلا کام جو سرکار نے مدینہ پہونچ کر کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھی۔ دیواریں کچی اینٹوں سے تین گز اونچی بنائی گئیں۔ نو فٹ پر چھت ڈال دی گئی۔ کھجور کے تنے سے شہتیر کا کام لیا گیا اور اس طور پر مسجد کی تکمیل کی گئی۔[۱]

علامہ طبرسی نے تعمیر کی کیفیت ذرا تفصیل سے لکھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مکانات میں، خانۂ خدا یعنی کعبہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے، کہ اُس کے معمار اور مزدور خلیل خدا حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے فرزند اسمٰعیلؑ تھے، تو مسجد نبوی کا یہ شرف بے مثال ہے کہ اس کی تعمیر میں فخر خلیل افضل المرسلین حبیب رب العالمین یعنی حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بنفس نفیس دوسرے مسلمانوں کے ساتھ، معمار اور مزدور دونوں کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ اور شروع سے لے کر آخر تک تعمیر کی جتنی منزلیں تھیں، سب میں آپ خود بنفس نفیس شریک رہے۔ حافظ ابن جریر کی تصریح بھی ہے کہ:-

تولی بناء مسجدہ صلے اللہ علیہ وسلم ھو بنفسہ واصحابہ من المھاجرین والانصار۔[۲]	اپنی مسجد کی تعمیر کا کام آپ نے خود کیا اور آپ کے ساتھ اور آپ کے اصحاب نے مہاجرین اور انصار میں سے۔

---

[۱] مسلمانان عالم ج ۱ ص ۶۹ [۲] طبری ج ۲ ص ۲۵۶

علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ سب سے پہلا کام زمین کا خشک کرنا تھا، اس لیئے کہ اس احاطے کے اندر ایک کثیر پانی کا ذخیرہ نبھی تھا۔ بغیر اس پانی کے اُلیچے ہوئے، اور اس گڑھے کو پاٹے ہوئے، کوئی عمارت بن نہیں سکتی تھی، چنانچہ آپنے اس کام کی تکمیل کرائی۔ پھر اینٹیں تیار کی گئیں اور نیو کھود کر اُسے اینٹوں سے بھرا گیا، پھر قریب کی پہاڑی سے جو حرا کہلاتی تھی پتھر لائے گئے، اور کئی دن تمام مسلمان پتھر منتقل کرتے رہے چنانچہ خود پیغمبرؐ کو بھی دیکھا گیا کہ آپ ایک بڑا پتھر اپنی پشت پر رکھے ہوئے لا رہے ہیں تو اُسید بن حضیر نے بڑھ کر عرض کیا کہ مجھے یہ پتھر دے دیجیئے، میں آپ کی طرف سے اسے پہونچا دوں۔ آپنے فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تن آسانی پسند کروں، کوئی دوسرا میری طرف سے مشقت اُٹھائے، چنانچہ کئی ردّے پتھروں کے چاروں طرف رکھنے کے بعد پھر اینٹوں کی چنائی شروع ہوئی، اور ایک قد آدم تک دیوار اونچی کی گئی۔ پوری وسعت اس عمارت کی سو ہاتھ مربع تھی۔ شروع میں چھت نہیں بنائی گئی تھی۔ کچھ عرصہ تک یوں ہی رہنے کے بعد جب دھوپ سے تکلیف محسوس کی گئی، تو لوگوں نے حضرتؐ سے استدعا کی کہ کوئی سایہ بھی یہاں ہو جائے، تب آپ نے مسجد کے آگے کے حصہ میں صحن سے متصل لکڑی کے کھمبے قائم کر کے کھجور کی چھال سے، جھانپوں کا کام لے کر ایک چھپر ایسا بنا دیا۔ پھر تھوڑے دن میں جب لوگوں نے کہا کہ باقاعدہ چھت بنوا دیجیئے، تو آپ نے انکار فرمایا، اور یہ تاریخی جملہ ارشاد کیا کہ

"لا عولیش کعولیش موسیٰ" — "نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ حضرت موسیٰؑ والے چھپر کی طرح چھپر ہی رہے[1]۔"

ہمدردوں کی وفات

ابو جعفر طبری کی تصریح ہے کہ مدینہ میں آ کر سب سے پہلے جس مسلمان کی وفات ہوئی، وہ آپ کو بیرون مدینہ اپنے مکان میں فروکش کرنے والے، کلثوم بن ہدم تھے، اور پھر دوسرے آپ کی ہجرت کے لیے زمین ہموار کرنے والے ابو امامہ اسعد بن زرارہ تھے[2]، اور آج چودہ سو برس کے بعد بھی کچھ کوتاہ نظر دعوے داران اسلام و ایمان کی جو ذہنیت ہے کہ اگر بقضائے الٰہی کوئی دنیا سے اُٹھ جائے تو وہ اس حادثہ کو کسی گزشتہ واقعہ سے مرتبط کر کے، ایک طرح کی نحوست کا تصور کر لیتے ہیں، اسے پیغمبر خداؐ نے یہودی اور منافق جماعتوں کی طرف نسبت دے کر اس کی غلطی نمایاں فرمائی، کہ دیکھو یہودی اور منافق تو یہ کہیں گے کہ اگر یہ نبی ہوتے تو ان کا ساتھ دینے والے جلدی سے مر نہ جاتے مگر وہ کہا کریں۔ یہ قضائے الٰہی کے کرشمے ہیں جنھیں کوئی روک نہیں سکتا۔

بنی نجّار کا فخر

مورخ طبری رقم طراز ہیں کہ ابو امامہ اسعد بن زرارہ کی وفات کے

---

[1] اعلام الوریٰ

[2] طبری ج ۲ ص ۲۵۶ - ۲۵۷ -

بعد، بنی نجار جمع ہو کر پیغمبر خدا ؐ کے پاس آئے اور کہا کہ ابو امامہ ہمارے نقیب (لیڈر) تھے، اب آپ ہم میں سے کسی کو منتخب کر دیجئے جو ان کی جگہ پر ہماری قیادت کرے۔ پیغمبر ؐ نے فرمایا کہ تم لوگ میری ننھیال ہے، اور اس لیئے میں بھی تم ہی میں سے ہوں، تو مجھ ہی کو اپنا نقیب سمجھ لو۔ وہ سب بڑے خوش واپس گئے، اور ان کے لیئے ایک بڑا فخر ہو گیا کہ رسول خدا ؐ اُن کے نقیب ہیں [1]

یاد رکھنا چاہیئے کہ با اصول فرد یا قوم کے چھوٹے چھوٹے واقعات میں بھی اُن کے بڑے اصول کارفرما رہتے ہیں۔ دین الٰہی کے زیر سایہ آنے کے بعد بھی، اگر جمہوریت کا حق خود ارادی والا اصول صحیح ہوتا؛ تو خود بنی نجار اپنا نقیب مقرر کر لیتے، یا جب رسول ؐ کے پاس آ کر خواہش کی کہ ہمارے لیئے نقیب مقرر کر دیجیے، تو حضرت ؐ ہی یہ فرماتے، کہ آپس میں شوریٰ کر کے کسی کو مقرر کر لو، میری کیا ضرورت ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ یہ اس اصول کا ایک مظاہرہ تھا کہ ایک مسلم جب دین الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر چکا تو اُس کا حق خود ارادی ختم ہو گیا۔ اب اُسے اپنے رہنما یا لیڈر کے انتخاب کا حق نہیں ہے، بلکہ خدا اور رسول ؐ جسے منتخب کر دیں، وہی اُن کا لیڈر اور سردار ہو گا۔ کیا آغاز میں یہ اصول سامنے آیا تو انجام میں یہ ختم ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ لن تجد لسنۃ

---

[1] تاریخ طبری ج ۲ صفحہ ۵

لسنۃ اللہ تبدیلا و لن تجد لسنۃ اللہ تحویلا۔

مہاجرین کی بحالی

تقسیم ہند اور تشکیل پاکستان کے بعد سے بحالیات کی اصطلاح ہر شخص کو معلوم ہو گئی ہے، اور دوسری لفظوں میں اُسے مہاجرین کی آبادکاری بھی کہتے ہیں۔ موجودہ وسائل و ذرائع کی ترقی کے دور میں بھی یہ قہار سلطنتوں کے لئے، ایک پیچیدہ کام ہوتا ہے۔ یعنی بے گھر لوگ جو بہت سے ایک دم آگئے ہیں، انھیں کہاں بسایا جائے اور ان کے لئے روزگار کہاں سے آئے۔ مدینہ میں مسلمانان مکہ کے منتقل ہونے کے بعد، جسے ہجرت کہتے ہیں، یہی اہم مسئلہ درپیش تھا مگر یہ مثل کہ اصل میں دل کے اندر جگہ کی ضرورت ہے، وہیں اصل ثابت ہوئی، جب ہم دیکھتے ہیں، کہ انصار کی فراخ حوصلگی سے، مہاجرین کے لیے یہ مسئلہ کوئی مسئلہ ہی معلوم نہ ہوا۔ مدینہ کے باشندوں میں سے جن کے پاس فاضل گھر تھے، اُنھوں نے تو اپنے فاضل گھر ان کے لیے خالی کر دیے، اور جن کے پاس ایک ہی گھر تھا اُنھوں نے بیچ میں پردہ ڈال کر کسی ایک مہاجر کو اپنے یہاں بسا لیا۔ اس طرح مہاجرین میں سے کسی متنفس کو بھی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ پھر جب مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی تو حضرت نے اس کے اطراف و جوانب میں اپنے لیے اور اپنے عزیز و اقارب

اور اصحاب کے لیئے رفتہ رفتہ مکانات تعمیر فرمائے جس کے بعد مہاجرین اپنے اپنے مکانات میں جا کر مقیم ہوئے۔

اصحاب صُفّہ

جیسا کہ خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری نے تحریر فرمایا ہے مسجد کے بالکل قریب حضور نے ایک صفّہ (چبوترا) بنایا تھا، جس پر گھانس پھونس کی چھت ڈال دی۔ اس چبوترے پر نادار و مفلس مسلمان پڑے رہتے تھے، اور اہل صفّہ یا اصحاب صفّہ کہلاتے تھے۔ سرکار رسالتؐ ان کی ضروریات کے کفیل تھے۔ آپ ان کے کھانے اور کپڑے کی خبر گیری فرماتے، اور اکثر اوقات ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

مواخات

اسلام کے وسیع نقطۂ نظر سے تو تمام انسان بھائی بھائی ہیں، جن میں نقطۂ اتحاد خالق کا ایک ہونا ہے، مگر چونکہ بھائی کے حقوق کو وہی یاد رکھ سکتا ہے، جو باپ کو یاد رکھے، اس لیئے عملی حیثیت سے اس برادری میں وہی منسلک ہو سکتے ہیں، جو خالق کی وحدت پر ایمان لائیں، اور اس لیئے قرآن نے یہ اعلان کیا کہ انما المؤمنون اخوۃ یعنی ایمان لانے والے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پھر حضرت

پیغمبر خداؐ نے اس اخوت کے جذبے کو قوی تر بنانے کے لیے، اپنے اصحاب میں مواخات قائم کی، یعنی دو شخصوں کو جو مختلف خاندان کے ہوتے تھے، اکثر صفات و عادات کی یکسانی پر نظر کرتے ہوئے، ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ یہ مواخات ایک مرتبہ مکہ میں مہاجرین کے درمیان قائم کی گئی تھی، اور اس مواخات میں سب کو ایک دوسرے کا بھائی بنانے کے بعد حضرت علی بن ابی طالبؑ کو جب کسی کا بھائی نہیں قرار دیا تھا، تو علیؑ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے کہ میں اکیلا رہ گیا، اور پیغمبرؐ نے علیؑ سے یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ تم کو میں نے اپنے لیے چھوڑ دیا، تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مواخات اُس نسبی رشتہ کے لحاظ سے نہ تھی جو رسولؐ اور حضرت علیؑ کے درمیان میں تھا، بلکہ رسولؐ کے اوصاف و اخلاق کا پرتو علیؑ میں جتنا تھا وہ اور کسی میں نہ تھا۔ اب مدینہ میں آنے کے بعد حضرت پیغمبر خداؐ نے دوبارہ مہاجرین و انصار میں آپس میں مواخات قائم کی اور ایک ایک مہاجر کا بھائی ایک ایک انصاری کو بنایا گیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ جس طرح پہلی مواخات میں، مہاجرین کے درمیان سے خاندانی تفرقہ کا تصور ختم، اور اس کے بجائے اوصاف اور اخلاقی اقدار کی اہمیت کا احساس نمایاں ہو، اس طرح اب مدینہ میں ملکی اور غیر ملکی کا امتیاز نظر انداز کر دیا جائے اور پھر نقطۂ مشترک اوصاف و اعمال رکھے جائیں، مگر اس مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات میں بھی سب کے لیے

اگرچہ یہ خصوصیت ملحوظ رکھی گئی، کہ ایک مہاجر ہو اور ایک انصاری، چنانچہ حضرت سلمان کا بھائی ابو درداؑ کو بنایا، اور ابو ذر کا منذر بن عمر کو، اسی طرح عمار یاسر کے ساتھ حذیفہ یمانی، مصعب بن عمیر کے ساتھ ابو ایوب انصاری، زبیر بن عوام کے ساتھ سلامہ بن وقش، ابو عبیدہ جراح کے ساتھ سعد بن معاذ، حضرت عثمان کے ساتھ اوس بن ثابت، حضرت عمرؓ کے ساتھ عتبان بن مالک اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ خارجہ بن زید، مگر اس دفعہ بھی آپ نے اپنے لیے اور حضرت علیؑ کے لیے کسی انصاری کو بھائی ہونے کے لیے منتخب نہیں کیا۔

اس سے ایک بہت بڑی بات یہ ذہن نشین کرنا تھی، کہ رسولؐ بحیثیت رسولؐ یا جو ایسے ہی دینی منصب کا حامل ہو، وہ کسی سرزمین سے تعلقِ خاص نہیں رکھتا، اور اس لیے وہ ملکی اور غیر ملکی، یا مہاجر اور انصار کی تفریق سے بالاتر ہے۔ یہ بات اُس وقت باقی نہ رہتی، جب آپ اپنا بھائی انصار میں سے کسی ایک کو قرار دیتے۔

یہودیوں سے معاہدہ

مدینہ میں عرصہ دراز سے کئی قبیلے یہود کے آباد تھے، ان میں بنی قریظہ اور بنی نضیر اور بنی قینقاع نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ باقی انہی کے ملازمین و متوسلین ہو گئے۔ یہ لوگ قدیم آسمانی کتابوں کے مندرجہ اطلاعات کی بنا پر ایک آخری رسول کے آنے کی پیشین گوئیاں

کیا کرتے تھے، مگر آپ رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم جو تشریف لائے
تو ان کے پیشوا اور سرگروہ آپ کی ذات سے اپنے اقتدار کی کرسی کو
متزلزل دیکھنے لگے، اس لیے وہ ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوئے ان کے
ساتھ انھیں یہ یقین تھا کہ آپ غلبہ اور اقتدار ضرور حاصل کریں گے، لہذا
شروع میں انھوں نے چاہا کہ اپنے کیش پر قائم رہتے ہوئے آپ کے ساتھ
معاہدے ایسے کرلیں جن سے سیاسی طور پر ان کا موقف محفوظ رہے
اور ان کے جان و مال کے لیے آئینی طور پر اطمینان حاصل ہو جائے۔

علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ ان کا وفد رسولؐ کے پاس آیا اور انھوں
نے کہا کہ سر دست ہم آپ سے معاہدہ کرنا چاہتے ہیں، جس کے شرائط یہ
ہوں گے کہ ہم کسی جنگ میں نہ آپ کو مدد دیں گے، اور نہ آپ کے
خلاف کوئی کارروائی کریں گے، اور کسی کی آپ کے خلاف امداد بھی
نہیں کریں گے، اور آپ کے اصحاب میں سے کسی سے کوئی تعرض نہیں
کریں گے، اور نہ آپ ہم سے اور ہمارے ساتھ کے کسی آدمی سے تعرض کیجیے
چنانچہ رسول خدا نے انہی شرائط پر ان سے معاہدہ کیا اور آخر میں یہ لکھ دیا
گیا کہ اگر انھوں نے اس عہد و پیمان کے خلاف عمل کیا تو پیغمبر خدا پھر
ان کی جان و مال کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ یہود کے تینوں قبیلوں میں سے
ہر ایک کے لیے ایک ایک دستاویز اس مضمون کی لکھی گئی۔ اس موقع پر
بنی نضیر کی نمائندگی حی بن اخطب نے کی اور بنی قریظہ کی کعب بن اسید
نے اور بنی قینقاع کی مخریق نے جو ان میں سب سے زیادہ اموال و باغات کا

مالک تھا۔[1]

مورخین امامیہ میں سے قدیم و مستند عالم علی بن ابراہیم بن ہاشم نے یہی شرائط درج کیے ہیں۔

مسٹر کے۔ اے حمید نے اس دستاویز کے دفعات حسب ذیل لکھے ہیں۔

۱۔ یہ معاہدہ محمدؐ اور دیگر اقوام کے درمیان ہے جو مسلمانوں سے کاروبار رکھتے ہیں۔

۲۔ بنی عوف کے یہودی مسلمانوں میں شمار کیے جائیں گے۔

۳۔ جو بیرونی دشمن اس معاہدہ میں شریک ہونے والی قوموں پر حملہ کرے گا تو سب مل کر بیرونی دشمن کی مدافعت کریں گے۔

۴۔ اس معاہدہ میں شریک ہونے والی قومیں ایک دوسرے کو فائدہ پہنچاتی رہیں گی۔

۵۔ جنگ کے مصارف کا بار سب پر یکساں ہوگا۔

۶۔ یہودیوں کی دوست دار قوموں کے حقوق یہودیوں کے برابر شمار کیے جائیں گے۔

۷۔ معاہدہ میں شامل ہونے والی قومیں مدینہ میں کبھی کشت و خون نہ کریں گی۔"

صحیفہ کی بعض ہمعصر اہل قلم نے اپنے ایک مقالہ میں جو "رسول اکرمؐ کی معاہداتی سیاست" کے عنوان سے ہے ایک طویل معاہدہ درج

---

[1] اعلام الوریٰ۔

کیا ہے جس کا نام صحیفہ ہے اور حق بجانب طور پر لکھا ہے کہ یہ تاریخ اسلام بلکہ اگر کہا جائے تو تاریخ عالم کا پہلا دستور ہے جو مدینہ میں ہجرت کے فوراً بعد حضور اکرمؐ نے مدینہ کے مختلف قبائل سے ملنے کے بعد نافذ فرمایا۔ یہ صحیفہ حسب ذیل ہے :-

١ - خدا کے پیغمبر محمد (صلعم) کا یہ معاہدہ مہاجرین قریش اور اہل یثرب (مدینہ) میں سے اسلام لانے والوں اور اُن سب لوگوں کے لیے نافذ ہوگا جو مذکورہ جماعتوں کے ساتھ متفق ہوں اور اُن کے ساتھ جنگ میں شریک رہیں۔

٢ - غیر معاہدین کے مقابلہ میں معاہدین کی ایک علیحدہ جماعت شمار ہوگی۔

٣ - مہاجرین قریش بجائے خود ایک جماعت ہیں۔ وہ حسب سابق اپنے مجرموں کی جانب سے دیت کی ادائگی کے ذمہ دار ہوں گے اور اپنے قیدیوں کو خود ہی فدیہ دے کر چھڑائیں گے۔ یہ سب کام ایمان وانصاف کے اصول کے تحت ہوں گے۔

٤ - بنی عوف، بنی حارث، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی نجار، بنی عمرو بن عوف اور بنی اوس اپنی اپنی جماعت کے لیے خود ذمہ دار ہوں گے، اور بدستور سابق اپنی اپنی دیت باہم مل کر ادا کریں گے اور اپنے قیدیوں کو خود ہی فدیہ دے کر چھڑانے کے ذمہ دار ہوں گے۔ یہ تمام کام اصول دیانت اور

انصاف کے تحت انجام پائیں گے۔

۵۔ مسلمانوں میں اگر کوئی مفلس کسی ایسے جرم کا مرتکب ہو جس پر دیت واجب ہو، یا کہیں قید ہو جائے اور فدیہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو، تو دوسرے مسلمانوں پر لازم ہوگا کہ وہ اس شخص کی جانب سے دیت یا فدیہ ادا کر کے اُسے چھڑائیں تاکہ مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں نیکی اور ہمدردی نمایاں ہو۔

۶۔ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے آزاد کردہ غلام کی مخالفت نہیں کرے گا۔

۷۔ مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے شخص کی علے الاعلان مخالفت کریں جو فتنہ و فساد برپا کرتا ہو اور خلق خدا کو ستاتا ہو، یا زبردستی کوئی چیز حاصل کرنا چاہے اور سرکشی اختیار کرے، ایسے شخص کو سزا دینے میں تمام مسلمان آپس میں متفق رہیں گے خواہ وہ شخص ان میں سے کسی کا فرزند ہی کیوں نہ ہو۔

۸۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ کسی مسلمان کو کسی محارب کے بدلے میں قتل کرے، یا کسی مسلمان کے مقابلے میں کسی محارب کو مدد پہونچائے۔

۹۔ خدا کا عہد، ذمہ داری اور پناہ ایک ہی ہے یعنی اگر کسی مسلمان نے کسی کو پناہ دی تو اس کی پابندی تمام مسلمانوں پر

لازمی ہوگی، خواہ پناہ دینے والا ادنیٰ درجہ کا مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ یہ تمام دوسروں کے مقابل میں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

۱۰۔ جن یہود نے ہمارے ساتھ معاہدہ کر لیا ہے اُن کے متعلق مسلمانوں پر واجب ہے کہ اُن کو مدد دیں اور مواسات کا برتاؤ کریں، ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے اور نہ ان کے خلاف اُن کے دشمن کو مدد دی جائے۔

۱۱۔ سب مسلمانوں کی صلح ایک ہی ہوگی، جب اللہ کی راہ میں جنگ ہو تو کوئی مسلمان دوسرے مسلمانوں کو چھوڑ کر دشمن سے اُس وقت تک صلح نہیں کرے گا جب تک وہ صلح سارے مسلمانوں کے لیے برابر اور یکساں نہ ہو۔

۱۲۔ اُن تمام جماعتوں کو جو ہمارے ساتھ جنگ میں حصہ لیں گی، نوبت بہ نوبت آرام کرنے کے لیے موقع دیا جائے گا۔

۱۳۔ جو مسلمان جہاد فی سبیل اللہ میں شہید ہو جائیں اُن کے پسماندگان کا تکفل تمام مسلمانوں پر واجب ہوگا۔

۱۴۔ بلاشبہہ تمام متقی اور پرہیزگار مسلمان راہ راست اور سب سے اچھے طریقے پر رہیں۔

۱۵۔ کوئی غیر مسلم معاہد قریش کی جان و مال کو کسی طرح کی پناہ نہ دے گا اور نہ کسی غیر مسلم کو کسی مسلمان کے مقابلہ میں مدد

ہو نچایا جائے گا۔

۱۶۔ کوئی شخص اگر کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دے اور ثبوت موجود ہو، تو قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ ہاں اگر مقتول کا وارث دیت لینے پر رضامند ہو جائے، تو دیت ادا کرکے گلو خلاصی ہو سکتی ہے، تمام مسلمانوں پر بلا استثناء اس امر کی تعمیل لازمی ہوگی۔ مذکورہ امور کے علاوہ اور کوئی چیز قابل قبول نہ ہوگی۔

۱۷۔ کسی مسلمان کے لیے جس نے اس صحیفہ کو تسلیم کرکے اس کی پابندی کا اقرار کر لیا ہے، اور وہ خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اس کے لیے یہ ہرگز جائز نہ ہوگا کہ وہ کوئی نئی بات پیدا کرے، اور نہ یہ جائز ہوگا کہ وہ کسی ایسے شخص سے معاہدہ رکھے جو اس معاہدہ کا احترام نہ کرتا ہو، جو شخص اس امر کی خلاف ورزی کرے گا قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوگا، اور اس بارے میں اس کا کوئی عذر اور توبہ قبول نہ کی جائے گی۔

۱۸۔ اہل معاہدہ میں جب کسی چیز کے متعلق آپس میں اختلاف پیدا ہو جائے، تو اس کے فیصلہ کے لیے خدا اور محمدؐ سے رجوع کیا جائے گا۔

۱۹۔ اس معاہدہ کے بعد یہود پر لازم ہوگا کہ وہ جنگ کی حالت میں جب کہ مسلمان کسی دشمن کے ساتھ برسرِ پیکار ہوں

مسلمانوں کو مالی امداد دیں۔

۲۰۔ بنی عوف، بنی النجار، بنی الحارث، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی الدوس، بنی ثعلبہ، بنی جفنہ اور بنی الشیطبہ کے یہود جنھوں نے اس معاہدہ میں شرکت کی ہے، اور مسلمانوں کے حلیف ہیں، اپنے مذہب کے پابند رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب کے پابند رہیں گے۔ مذہبی باتوں کے علاوہ باقی امور میں مسلمان اور یہود ایک جماعت شمار ہوں گے۔ ان میں اگر کوئی شخص ظلم یا عہد شکنی یا جرم کرے گا تو وہ اپنے جرم کی سزا کا مستحق ہو گا۔

۲۱۔ یہود کے مذکورہ بالا قبائل کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ان کو حاصل ہیں۔

۲۲۔ معاہدہ کرنے والوں میں کوئی محمدؐ کی اجازت کے بغیر فوجی اقدام نہیں کرے گا۔

۲۳۔ کسی زخم یا ضرب کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی جو شخص بھی عہد شکنی کرے گا وہ اس کی سزا کا مستحق ہو گا، اور جو شخص اس صحیفہ کی زیادہ سے زیادہ وفادارانہ تعمیل کرے گا خدا اس کی مدد کرے گا۔

۲۴۔ اگر مسلمان اور یہود معاہدین کے خلاف کوئی تیسری قوم جنگ کرے تو ان تمام معاہدین کو متفق ہو کر لڑنا ہو گا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے، اور باہم بہی خواہی اور وفا شعاری ہو گی۔ یہودی اپنے مصارف جنگ برداشت کریں گے،

اور مسلمان اپنے مصارف۔

۲۵۔ یہود اُس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے، جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔

۲۶۔ یثرب کا میدان جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، اس معاہدہ میں شریک ہونے والوں کے لیے حرم (مقدس مقام) ہو گا۔

۲۷۔ پناہ گزین سے بھی وہی برتاؤ کیا جائے گا، جو پناہ دہندہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اُس کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچایا جائے گا پناہ گزین پر اس معاہدہ کی تعمیل لازم ہو گی، اور اُسے عہد شکنی کی اجازت نہ ہو گی۔

۲۸۔ کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

۲۹۔ اہل معاہدہ میں اگر کوئی حادثہ یا اختلاف رونما ہو، جس سے نقض امن کا اندیشہ ہو تو اُس کے فیصلہ کے لیے خدا اور محمد رسول اللہ سے رجوع کیا جائے گا۔ جو شخص اس صحیفہ کی زیادہ سے زیادہ تعمیل کرے گا خدا اُس کے ساتھ ہو گا۔

۳۰۔ قریش مکہ اور اُن کے مددگار کو کوئی شخص پناہ نہیں دے گا۔

۳۱۔ اگر کوئی یثرب (مدینہ) پر حملہ آور ہو گا تو مسلمان اور یہود دونوں فریق مل کر مدافعت کریں گے۔

۳۲۔ اگر مسلمان کسی سے صلح کریں گے، تو مسلمانوں پر بھی لازم ہو گا کہ

یہود کے ساتھ ایسا ہی تعاون کریں۔ البتہ کسی فریق کی اپنی مذہبی جنگ میں دوسرے فریق پر تعاون کی ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔

۴۳۔ یثرب پر حملہ کی صورت میں ہر جماعت کو اُس حصّہ کی مدافعت کرنا ہوگی جو اُس کے بالمقابل ہو۔

۴۴۔ قبیلہ اوس کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس صحیفہ میں شریک ہونے والوں کو حاصل ہیں، بشرطیکہ وہ بھی وفاداری کا اظہار کریں۔ جو اس صحیفہ کی زیادہ سے زیادہ وفاداری کے ساتھ تعمیل کرے گا خدا اُس کا حامی و مددگار ہوگا۔

۴۵۔ اس معاہدہ میں شریک ہونے والی جماعتوں میں سے اگر کسی فریق یا جماعت کو جنگی ضرورت سے مدینہ سے باہر جانا پڑے تو وہ امن و حفاظت کی مستحق ہوگی اور جو مدینہ میں رہے اُس کے لیے بھی امن ہوگا، کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا نہ کسی کے لیے عہد شکنی جائز ہوگی۔ جو اس صحیفہ کا سچّے دل سے احترام اور تعمیل کرے گا، اُس کے لیے اللہ اور اُس کا رسول محمد صلعم نگہبان ہیں۔ [1]

---

[1] ماخوذ "دعوت"، دہلی، شمارہ خاص سرور عالم ربیع الاول ۱۳۸۵ھ صفحہ ۱۲۱، ۱۲۶۔

ہمیں اس صحیفہ کا اصل ماخذ ابھی دستیاب نہیں ہوا ہے اس لیے معاصر موصوف کے الفاظ ہی میں اسے درج کر دیا گیا ہے، حالانکہ ہمارے نزدیک بعض جگہ اس میں اصل عبارت کے ترجمہ میں کسی حد تک کوتاہی پائی جاتی ہے، جس کی اصل ماخذ سے مقابلے کے بعد ہی تصحیح ہو سکتی ہے۔

اذان اور اقامت کی تشریع

مکہ میں معدودے چند مسلمان تھے جو پیغمبر کے ساتھ نماز جماعت میں شریک ہو جاتے تھے۔ اب مدینہ میں آنے کے بعد جب مسلمانوں کی تعداد جماعتوں میں کافی ہونے لگی، تو ضرورت پڑی کہ اوقات نماز پر کوئی طریقہ اس اعلان کا ہو کہ اب نماز ہو رہی ہے، اور پھر جماعت میں آنے والوں کے لیے کوئی طریقہ ہو، جو بتلائے کہ اب نماز شروع ہو رہی ہے۔ پہلے اعلان کا مقصد اذان سے پورا ہوتا ہے اور دوسرے اعلان کا مقصد اقامت سے چنانچہ جیسا کہ سیرت حلبیہ وغیرہ میں ہے ہجرت کے پہلے سال اذان اور اقامت کی تشریع ہوئی۔

روایات اہل سنت میں اذان کا رواج قائم ہونے کے مختلف اسباب درج کیے گئے ہیں جو ائمہ اہل بیتؑ کے تعلیمات کے رو سے ناقابل قبول ہیں۔ ان پر میں نے اپنے رسالہ "تحقیق اذان" میں

سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، ہمارے نزدیک اتنے اہم شرعی حکم کی بنیاد نہ کسی خواب پر ہو سکتی ہے اور نہ کسی صحابی کے مشورے پر، بلکہ اس کا تعلق بالکل حکم الٰہی سے ہے جیسا کہ علامہ سید محسن امین عاملی نے تحریر فرمایا ہے :-

ما فی طبقات ابن سعد و سیرۃ ابن ھشام من ان سبب وضع الاذان والاقامۃ رؤیا رأھا بعض الانصار باطلٌ لا یلتفت الیہ فان الاحکام الشرعیۃ ما کان یشرعھا بالمنامات ان ھو الا وحی یوحیٰ و فی السیرۃ الحلبیۃ عن محمد بن الحنفیۃ انکار ذٰلک اشد الانکار۔

جو طبقات ابن سعد اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ اذان اور اقامت کے قرار دیے جانے کا سبب ایک خواب ہے، جو بعض انصار نے دیکھا تھا، یہ غلط چیز ہے جو قابل توجہ نہیں ہے اس لیے کہ احکام شرعی کو رسولؐ خوابوں کی بنا پر جاری نہیں فرماتے تھے، وہ تو وحی ہوتی تھی جو آپ پر آتی تھی اور سیرت حلبیہ میں محمد ابن حنفیہ کی زبانی اس کا سخت انکار درج کیا گیا ہے۔

نماز کی چار رکعتیں

علامہ طبری لکھتے ہیں :-

و فی ھٰذہ السنۃ زید فی صلوۃ الحضر رکعتان

سلہ اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۱۲۳

وکانت صلوٰۃ الحضر والسفر رکعتین وذٰلک بعد مقدم رسول اللہ صلعم المدینۃ بشھر فی ربیع الآخر لمضی اثنتی عشرۃ لیلۃ منہ[1]۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ابتدائے بعثت رسولؐ سے اب تک ہر نماز دو رکعت کی تھی، ہجرت کے ایک مہینہ کے بعد ماہ ربیع الثانی میں اُن نمازوں میں جو بحالت حضر ہو ظہر و عصر اور عشاء میں دو رکعتوں کا اضافہ ہو گیا۔

مورخ کی جو فقط مورخ ہی نہیں ہے بلکہ اہل سنت میں ایک امام فقیہ اور حافظ احادیث کی حیثیت بھی رکھتا ہے یہ تصریح ہے کہ اصل تشریع میں یہ اضافہ مقید حضر کے ساتھ تھا تو پھر فقہی حیثیت سے سفر کی حالت میں اس اضافہ کی بطور رخصت بھی کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵

آغازِ جہاد اور اُس کے اسباب

مشرکین مکہ کو اگر فقط پیغمبرؐ کی ذات سے دشمنی ہوتی تو وہ آپ کی ہجرت سے اطمینان کی سانس لیتے کہ جو ہمارا دشمن تھا وہ ہمارے درمیان سے چلا گیا، اور اب ہم سے اُس سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا، مگر انھیں تو اُس مشن سے عداوت تھی جسے پیغمبرؐ پھیلا رہے تھے، اور اس لیے اُنھوں نے آپ کی ہجرت کے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ رات کو آپ کے مکان کا محاصرہ کرکے آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیں، مگر وہ قدرت کی طرف کا انتظام تھا جس سے وہ اپنے منصوبے میں ناکام رہے، اور آپ صحیح سلامت مدینہ پہونچ گئے، ان حالات کا بیان پہلے آ چکا ہے۔

یہ ایک بہت بڑی شکست تھی جو انھیں آپ کے مقابل میں ہوئی، وہ دیکھ رہے تھے کہ اب آپ ایسے مرکز پر پہونچ گئے ہیں، جہاں آپ آزادی سے اپنے دین کی تبلیغ کریں گے۔ اُن کو شروع میں یہ اُمید ہوگی کہ اوس اور خزرج کی باہمی رقابت مدینہ میں آپ کے لیے باعث زحمت ہوگی، یعنی اگر اوس نے آپ کا ساتھ دیا تو خزرج مخالف صف میں ہوں گے، اور اگر خزرج والے زیادہ آپ کے طرفدار ہوئے، تو اوس کے لوگ آپ کے مقابلے میں صف بستہ ہوں گے، مگر یہ اُمید اُن کی ختم ہوگئی جب اُنھیں خبر ملی کہ آپ نے

اوس اور خزرج دونوں کو گلے ملا دیا، اور وہ دونوں اب آپ کے انصار میں داخل ہو کر ایک قوم ہو گئے ہیں۔ پھر دوسری بڑی اُمید اُن کو یہود سے ہو سکتی تھی کہ وہ ثروت اور طاقت دونوں کے مالک ہونے کی بنا پر مدینہ میں ایک بڑے حزب مخالف کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں، مگر پیغمبرؐ نے یہود کے ساتھ مذکورۂ بالا معاہدہ کرکے اُن کی اس اُمید کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پھر بھی وہ خاموشی کے ساتھ اس اسلام کی ترقی کو تو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اور اس کے لیے وہ مدینہ میں انتشار پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ ڈھونڈھ رہے تھے کہ اُنھیں اپنے جاسوسوں کے ذریعے سے یہ ایک خوش آیند خبر ملی کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے، اُن میں ایک منافقین کی جماعت بھی موجود ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو درپردہ اپنے قدیم خیالات پر قائم ہیں مگر وہ مصلحتاً اسلامی جماعت میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان کا سرگروہ عبداللہ ابن اُبی تھا جس کا ذکر جلد اول میں ہو چکا ہے، چنانچہ اُنھوں نے عبداللہ ابن اُبی کو لکھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ حضرتؐ کو مدینے سے نکلوا دے۔

جیسا کہ مسٹر کے، ایل حمید نے لکھا ہے قریش نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ عبداللہ کی وساطت سے اہل مدینہ کو لکھا:

"اے باشندگان مدینہ تم نے ہمارے خاندان کے ایک شخص محمدؐ کو اپنے یہاں ٹھہرا لیا ہے۔ ہم تم کو مطلع کرتے ہیں کہ تمھاری

خیریت اسی بات میں ہے کہ ان کو مدینہ سے نکال دو، ورنہ اس سے
جنگ کرو اور اُسے گرفتار کر کے ہمارے حوالے کر دو۔ اگر تم نے
ہماری مرضی کے مطابق نہ کیا تو ہم نے متفقہ طور پر حلف کیا ہے
کہ تم پر حملہ کر کے تمھاری عورتوں پر قبضہ کر لیں گے اور تمھارے
نوجوانوں کو قتل کر ڈالیں گے۔"

اس خط کے ملنے پر ایک دن عبداللہ اور اُس کے رفقاء رسول خدا پر
حملہ کرنے کی تجاویز پر غور و خوض کر رہے تھے، عین وقت پر جناب
رسول خدا کو اس کا علم ہو گیا اور آپ بہ نفسِ نفیس جہاں مجلس مشاورت
قائم تھی وہاں پہونچ گئے، اور حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا "قریش
نے تم کو دھوکا دیا ہے، اگر تم نے اس سرزمین پر کشت و خون کرنے کا
ارادہ کیا تو تمھیں سخت نقصان پہونچے گا، اور پھر تمھیں اپنے بھائیوں
کا خون بہانا ہوگا جو ہمارا ساتھ دیں گے، بلکہ تمھارا فرض یہی ہے کہ
جیسا تمھاری قوم نے میرے ساتھ دینے کا عہد و پیمان کیا ہے، اگر
کوئی اس شہر پر حملہ کرے تو تم سب ہمارے ساتھ مل کر اُس کا دفعیہ
کرو۔" بروقت اس راز کے کھل جانے سے اور آپ کی تقریر سے یہ
منصوبہ درہم و برہم ہو گیا[1]۔

مشرکین کی یہ ابتدائی کارروائیاں خود بتلا رہی ہیں کہ اب
اگر جنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو اُس کا آغاز کس جانب سے ہوگا۔

---

[1] سلمانانِ عالم حصہ اول صفحہ

یہ بھی بڑی قابل لحاظ بات ہے کہ رسول کے مدینہ میں تشریف لانے کے بعد ایک سال تک کوئی خونریز تصادم آپ کا کسی جماعت سے نہیں ہوا ہے۔ اگر آپ کو جنگ کرنا مقصود ہوتی تو یہ ایک سال کا وقفہ آپ جنگ کی تیاری میں صرف فرماتے، جب کہ اس ایک سال میں تعمیری کام کافی انجام دیے گئے۔ تین تین مسجدیں بن گئیں، ایک مسجد قبا، دوسری مسجد بنی سالم اور تیسری مسجد نبوی۔ مہاجرین کی بحالی کا کام انجام دیا گیا، اور خاندان رسول اور دیگر مہاجرین کے لیے مکانات کی تعمیر ہو گئی۔ احکام شرعی اور انتظام اجتماعی کے دستور کا نفاذ ہو گیا، مگر اس ایک سال کی مدت سے آپ نے سامان جنگ کی فراہمی میں کیا فائدہ اٹھایا؟ یہ حال اس وقت کھلے گا جب دوسرے سال اسلام کی پہلی لڑائی ہو گی اور مسلمانوں کے پاس لڑنے کے لیے ہتھیار اور سوار ہونے کے لیے مرکب بھی موجود نہ ملیں گے۔ یہ آپ کا عمل خود بتاتا ہے کہ مدینہ میں آکر آپ کا نصب العین اہل مکہ سے جنگ کرنا نہ تھا۔ جس کے پاس ساز و سامان جنگ اس طرح مفقود ہو وہ خود سے جنگ کی چھیڑ چھاڑ کبھی نہیں کرے گا۔ یہ اور بات ہے کہ زبردستی اس کے سر پر جنگ عائد کر دی جائے تو وہ اپنے ساتھیوں سمیت سر سے کفن لپیٹ کر میدان میں نکل آئے۔

قرآنی تصریحات اور اُن کی تاریخی اہمیت — یوں تو قرآن ایک مذہبی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے جو بحیثیت اپنے

تعلیمات و احکام دوسرے اہل مذاہب کو زبردستی منوایا نہیں جا سکتا
مگر یہ اس کے اعتقادی حصے یعنی غیبی اطلاعات یا عقائد و احکام کے
بارے میں کہا جا سکتا ہے، لیکن ایک اس کی تاریخی حیثیت ہے، اور وہ یہ
کہ یہ کتاب حضرت پیغمبر اسلام نے پیش فرمائی۔ یہ چیز مذہب و ملت کی
تفریق سے بالاتر ہے۔ یہی اس کتاب کا وہ امتیاز ہے جو دنیا کی کسی دوسری
آسمانی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ اب اس کتاب میں گزشتہ انبیاء کے
متعلق جو واقعات ہیں، انھیں کوئی غیر مسلم چاہے تاریخی حیثیت سے اس بنا پر
اہمیت نہ دے کہ وہ حضرت محمد مصطفےٰ کے عام طبعی اسباب کے لحاظ سے چشم دید
نہیں ہیں یا بعد کے متعلق جو خبریں ہیں مثلاً قیامت وغیرہ کے حالات انھیں
وہ نہ مانیں اس بنا پر کہ یہ چیزیں ابھی وقوع میں نہیں آئیں لیکن خود پیغمبر خدا
کے اپنے حالات اور واقعات کے متعلق قرآن میں جو تذکرے ہوں انھیں
تو ایک غیر مسلم کے نزدیک بھی تاریخی حیثیت سے اہمیت حاصل ہونا چاہیے۔
پھر رسولؐ کی ہستی وہ تھی جس کی خاص صفت کافروں کے نزدیک
سچائی تھی جس کی بنا پر آپ کا لقب ہی صادق و امین ہو گیا تھا۔
اگر اس کے خلاف حالیہ واقعات کے بیان کرنے میں کوئی بھی بات
اُن کے نزدیک قابل گرفت ہوتی تو اس وقت کی دنیائے کفر آسمان
سر پر اُٹھا لیتی اور شور مچاتی کہ یہ کیا خلاف واقعہ بات آپ کہہ رہے ہیں۔
اب دیکھیے کہ قرآن نے آغاز جنگ کا پس منظر کیا بیان کیا ہے اور
اس کے بعد فیصلہ کیجیے کہ پیغمبرؐ کی جنگ جارحانہ حیثیت رکھتی تھی

یا مدافعانہ، قرآن مجید میں جہاد کے سلسلہ میں جو آیت اپنے مضمون کے لحاظ سے سب سے پہلی آیت معلوم ہو رہی ہے وہ یہ ہے :-

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر ۝ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز ۝

(سورہ حج آیت ۳۹ و ۴۰)

اجازت دی جاتی ہے اُن لوگوں کو جن سے جنگ کی جا رہی ہے اس بنا پر کہ اُن پر مظالم ہوئے ہیں اور یقیناً اللہ اُن کی مدد پر قادر ہے۔ وہ جنہیں نکالا گیا اُن کے گھروں سے ناحق بغیر کسی خطا کے سوا اس کے کہ وہ کہتے تھے ہمارا مالک اللہ ہے اور اگر نہ ہوتا دفع کرنا اللہ کا بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے سے تو گرا دیے جاتے گرجے اور مختلف مذاہب کے معابد اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر بہت ہوتا ہے اور ضرور اللہ مدد کرے گا اُس کی جو اُس کی مدد کرے یقیناً اللہ طاقت والا ہے غالب آنے والا۔

اس آیت میں حسب ذیل امور قابل لحاظ ہیں۔

(۱) اس آیت کا آغاز اذن سے ہو رہا ہے جس کے معنی اجازت کے ہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس آیت سے پہلے مسلمانوں کے لیے جنگ کرنا ممنوع تھا اور اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ یہ سب سے پہلی آیت ہے

جو جہاد کا حکم لے کر اُترتی ہے۔

دوسری جگہ قرآن میں یہ ذکر آیا ہے کہ

الم تر الی الذین قیل لھم کفوا ایدیکم و اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ فلما کتب علیھم القتال اذا فریق منھم یخشون الناس کخشیۃ اللہ او اشد خشیۃ وقالوا ربنا لم کتبت علینا القتال لولا اخرتنا الی اجل قریب ؕ (سورہ نساء آیت ۷۷)	کیا تم نے نہیں دیکھا اُن لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رہو اور نماز پڑھو زکوٰۃ دو تو جب اُن پر جنگ کرنے کا فرض عائد کیا گیا تو ایک دم یہ منظر آیا کہ اُن میں کا ایک گروہ آدمیوں سے اتنا ڈرتا ہے جتنا اللہ سے ڈرتا ہو یا اس سے بھی زیادہ اور اُنھوں نے کہا کہ پروردگار تو نے ہم پر جنگ کا فریضہ کیوں عائد کیا؟ کیوں نہ ہمیں کچھ اور مہلت دی؟۔

اس آیت میں سلسلۂ بیان کی ایک کڑی سیاق سے سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب خالق کی جانب سے ہاتھ روکے رہنے کا حکم تھا اور یہ کہ بس اپنی جگہ پر جو عبادتیں تمھارے ذمہ ہیں مثلاً نماز و زکوٰۃ یہ انجام دیتے رہو اور مخالفین سے کوئی سروکار نہ رکھو تب مسلمانوں میں ایک جماعت اس رواداری کی تعلیم سے کبیدہ خاطر تھی اور اُس کا اصرار تھا کہ اب ہمیں جنگ کی اجازت دیجیے اور اسی سے ربط بعد کے فقرہ کا ہے کہ یہ جماعت پہلے تو یوں جنگ پر اصرار رکھتی تھی اور جب حکم جنگ

آیا تو یہی کمی کمزوری کا ثبوت دینے لگی۔

(۲) اجازت جہاد کا پس منظر اس لفظ سے پیش کیا گیا کہ ان سے جنگ کی جا رہی ہے۔ یہی فعل مجہول (یُقَاتَلُوْنَ) کے لفظی معنی ہیں۔ اگر یُقَاتِلُوْنَ ت کے کسرہ کے ساتھ ہوتا تو یہ معنی ہوتے کہ یہ جنگ کر رہے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ کی ابتدا مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہے بلکہ مشرکین حملہ آور ہوئے ہیں تب انھیں مدافعت کا اذن ملا ہے۔ اگر ابتدا ان کی طرف سے ہوتی تو یہ الفاظ ہوتے کہ اجازت دی جاتی ہے ان کو جو جنگ کر رہے ہیں اس بنا پر کہ ان پر مظالم ہوئے ہیں۔

(۳) اس صورت حال کے ساتھ کہ جنگ کی ابتدا کافروں کی طرف سے ہوئی ہے پھر گزشتہ پوری تاریخ جو بعثت رسولؐ سے اب تک کی تھی اُس کا حوالہ ایک بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا کی لفظ سے دیا گیا ہے کہ ان پر پہلے سے مظالم ہوتے آئے ہیں مگر ان مظالم کے باوجود بھی ان کو جنگ کی اجازت اُس وقت تک نہیں دی گئی جب تک اُدھر سے آغاز جنگ نہیں ہو گیا۔

(۴) "یقیناً اللہ اُن کی مدد پر قادر ہے" اس میں ایک بلیغ اشارہ اس طرف ہے کہ مسلمانوں کی مادی طاقت اس وقت ایسی نہیں ہے کہ یہ مشرکین سے ٹکرا سکیں مگر یہ صرف خدا پر بھروسا کر کے اُن کے مقابلہ کے لیے آمادہ ہو سکتے ہیں۔

(۵) "ما ظلموا" کا جو اجمال تھا اُس کی تفصیل کے مقام میں

اُن کے مظالم کا سب سے آخری جو نتیجہ تھا اُسے صراحۃً بیان کیا گیا ہے کہ اُن کے ہاتھوں یہ گھر سے بے گھر ہوئے ہیں اور غربت و مسافرت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

(۶) آخر میں اس اذنِ جہاد کے فلسفہ کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی وقت بھی ایسا نہ ہو جب اہل حق کو باطل سے ٹکر لینے کی اجازت دی جائے یعنی ہمیشہ ہی خاموشی برقرار رکھی جائے تو ظالموں کی ہمت بڑھتی جائے گی اور اُنھیں ظلم کے راستے میں کسی رکاوٹ کا اندیشہ نہ رہے گا اور پھر صرف اسلامی معبد یعنی مساجد ہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی مذہب کے مقدسات محفوظ نہیں رہ سکتے اور اس طرح قرآن نے فلسفۂ جہاد تمام دنیا کی قوموں کو بتانا چاہا ہے۔ اگر صرف مسلمانوں کو بتانا ہوتا تو مساجد کے انہدام کا ذکر کافی تھا۔ صوامع اور بیع اور صلوات یعنی دوسرے مذاہب کے معبدوں کا ذکر نہ کیا جاتا۔

(۷) فلسفۂ جہاد بتاتے ہوئے قرآن نے دفع کی لفظ صرف کی ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ جارحانہ جنگ نہیں ہے بلکہ مدافعانہ ہے اور یہ اُس وقت کے قرآنی اصول کی آج چودہ سو برس کے بعد فتح ہے کہ آج دنیا کی متمدن حکومتوں میں محکمۂ جنگ کا نام ہی محکمۂ دفاع ہو گیا ہے اور وزیر جنگ کے بجائے وزیر دفاع مقرر کیے جاتے ہیں۔

بے بنیاد روایات کا درایتی جائزہ { پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں کی اہل مکہ کے مقابلہ میں سب سے پہلی خونریز جنگ بدر میں

ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے اس جنگ کے پس منظر میں خود مسلمان تاریخوں میں یہ حکایت آگئی ہے کہ اس کے پہلے مسلمانوں نے مشرکین کے تجارتی قافلوں پر جو مکہ سے شام جاتے تھے حملے شروع کر دیے تھے اور بعض دفعہ سامان لوٹ لیا تھا، اس کے بعد ابوسفیان جو ایک بڑے تجارتی سامان کے ساتھ شام گیا ہوا تھا اُسے خبر ملی کہ مسلمان اس قافلہ پر حملہ کریں گے اور سامان تجارت کو لوٹ لیں گے۔ اس کی اطلاع اُس نے مکہ میں روانہ کر دی جس کی بنا پر اس قافلہ کی حفاظت کے لیئے مکہ سے فوج روانہ ہوئی چونکہ مدینہ مکہ اور شام کے عین وسط میں واقع تھا، اُدھر سے مدینہ کی طرف تجارتی قافلہ آرہا تھا اور ادھر سے ابوجہل کی سرکردگی میں یہ حفاظتی فوج آرہی تھی۔ پیغمبر کو یہ اطلاع ہوئی تو آپ اپنے ساتھ کے لوگوں کو لے کر قافلہ پر حملہ کے ارادہ سے باہر نکلے مگر قافلہ کسی اور راستے سے نکل گیا اور مسلمانوں کا مقابلہ اس فوج سے ہو گیا۔ اس طرح وہ معرکہ پیش آیا جس کا نام جنگ بدر ہے۔

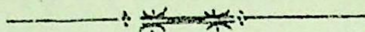
جنگ کے اسباب کو اس نوعیت سے مانا جائے تو سلسلۂ جنگ کی ذمہ داری پیغمبر اسلام پر عائد ہوتی ہے مگر ہم نے جو قرآنی آیت پیش کی ہے جس میں قرآن نے ابتدائے جنگ کی نوعیت پر تبصرہ کیا ہے وہ اس روایت کو غلط ثابت کرتی ہے۔ اگر صورت حال یہ ہوتی اور پھر قرآن یہ کہتا کہ اجازت دی جاتی ہے اُن لوگوں کو جن سے جنگ کی جا رہی ہے، تو اُس وقت کی دنیائے کفر و شرک ایک دم چیخ اٹھتی

کہ یہ کیا خلاف واقعہ بات ہے؟ ہمارے قافلہ کی لوٹ مار کے ساتھ ابتدائے جنگ آپ کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ہم سے جنگ کی جا رہی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود سے جنگ نہیں کر رہے ہیں۔ قرآن کی سچائی پر کوئی اعتراض نہ ہونا اس کا ثبوت ہے کہ واقعہ یہی تھا جو قرآن نے بیان کیا ہے۔ اس کے لئے ہم نے اس بحث کی تمہید میں یہ دکھلایا تھا کہ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت صرف تعبدی پہلو نہیں رکھتی جس کے سامنے ہر مسلمان ہی مجبور ہو بلکہ وہ درایتی لحاظ سے ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے جس کا ماننا غیر مسلم محققین کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا متکلم یا اس کلام کا حامل وہ ہے جس کی صفت خاص سچائی رہی ہے۔ اُس نے اپنی سچائی ہی کا حوالہ دیتے ہوئے یا اس کا اقرار لیتے ہوئے اپنا پہلا پیغام پیش کیا تھا اور اُس کے تمام مخالف لیڈروں نے اقرار کیا تھا کہ ہم نے اس زبان سے سوا سچ کے جھوٹ نہیں سُنا۔ پھر اب ایسی صاف خلاف واقعہ بات اُن کے سامنے کیونکر پیش کی جا سکتی تھی اور وہ اس پر کیونکر خاموش رہ سکتے تھے؟!

پھر اسی کے ساتھ جب جنگ بدر کا سامان دیکھا جاتا ہے جیسا کہ بعد میں آئے گا کہ لشکر اسلام میں تلواریں بھی نہ تھیں اور سوار ہونے کے لیے مرکب بھی نہ تھے تو اس سے بھی عقلی طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی صاحب عقل جس کے پاس یہ ساز و سامان ہو اپنی طرف سے آغاز جنگ نہ کرے گا اس لیے یقینی طور پر سمجھنا چاہیے کہ تاریخ اسلام

میں جنگ بدر کے اسباب میں اس روایت کا آجانا بالکل ویسا ہی ہے
جیسے واقعۂ کربلا کے پس منظر میں بعض مسلم تاریخوں میں یہ روایت آگئی
ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے یمن سے آتے ہوئے باربردار
اونٹوں کو جو یمن کا محاصل یزید کے پاس پہونچانے کے لیے دمشق جارہے
تھے راستے میں روک لیا اور اُن کا سب سامان اپنے قبضہ میں کر لیا
اس طرح یزید کے خلاف جارحانہ اقدام کی ذمہ داری آپ پر عائد
ہو گئی۔ ہمارے نزدیک نانا کے خلاف وہ روایت وضع کر کے بدر
کی ذمہ داری اُن پر ڈالنا اور نواسے پر یہ الزام عائد کر کے واقعۂ کربلا
کی ذمہ داری اُن پر عائد کرنا دونوں ایک ہی خاندان اور اُس کے
ہواخواہوں کی کارستانی ہے جنھوں نے باطل کے مقابلہ میں اہل حق کے
کردار کو داغدار بنانے کے لیے یہ روایت وضع کی ہے مگر ہمارے
نزدیک حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے بہ بانگ بلند یہ
قرآنی اعلان کہ "اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا" اجازت
دی جاتی ہے انھیں جن سے جنگ کی جا رہی ہے اس وجہ سے کہ
اُن پر مظالم ہوتے آرہے ہیں،" اور اس پر تمام دنیائے کفر و شرک کی
خاموشی اور کوئی احتجاج نہ کرنا اور کربلا میں حضرت امام حسینؑ کا
اپنی مخالف تیس ہزار کی فوج کے سامنے خطبہ میں یہ ارشاد کہ کیا
میں نے کوئی مال لے لیا ہے جس کا مجھ سے مطالبہ ہے یا کوئی خون
کیا ہے جس کا قصاص مجھ سے لینا ہے؟ اور اس کے جواب میں مخالف

جماعت کی طرف سے مکمل سکوت اور کسی الزام کا آپ پر عائد
نہ کر سکنا یہ دونوں باتیں ان دونوں الزاموں کے غلط ہونے کا
قطعی ثبوت ہیں ۔



بدر سے پہلے کی آویزشیں اور اُن کی نوعیت

غزوات کے سلسلہ میں سب سے پہلے جو نام ذہن میں عموماً آئے گا وہ بدر کا ہے مگر تاریخ میں بدر سے پہلے چند آویزشوں کا مشرکین کے ساتھ تذکرہ ہے جن میں سے اصطلاحی طور پر بعض کو غزوہ اور بعض کو سریّہ کہا جاتا ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جن میں خود رسولؐ تشریف لے گئے ہوں وہ غزوات ہیں اور جن میں کسی اور کو سردار بنا کر بھیج دیا ہو وہ سرایا ہیں۔ علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ غزوات کی تعداد چھبیس ۲۶ اور سرایا کی چھتیس ۳۶ ہے[1]۔ علامہ سید محسن امین عاملی کہتے ہیں کہ سیرت حلبیہ میں غزوات کی تعداد ستائیس ۲۷ بتائی ہے اور تفصیل جو بتائی ہے اس میں اٹھائیس ۲۸ ہوتے ہیں۔ اس ترتیب میں غزوۂ بدر چوتھا قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح کہ:-

(۱) بواط (۲) عشیرہ (۳) سفوان (۴) بدر الکبریٰ[2]۔ ان کے درمیان میں تین چار سریّوں کا ذکر ملتا ہے اور اس طرح مجموعی طور پر بدر کا نمبر جنگی کارروائیوں میں تقریباً ساتواں پڑ جاتا ہے۔

سطحی نگاہ والے مورخین روئداد کو اس طرح سے لکھ دیتے ہیں

---

[1] اعلام الوریٰ [2] اعیان الشیعہ ج ۲ صفحہ ۱۵۰

جس سے دیکھنے والے کا ذہن یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ پھریرے پیغمبر اسلام کی طرف سے ہوئی ہے جیسا کہ مورخ طبری نے لکھا ہے :-

(١) زعم الواقدی ان رسول اللہ عقد فی ھذہ السنۃ فی شھر رمضان علی راس سبعۃ اشھر من مھاجرہ لحمزۃ بن عبد المطلب لواء ابیض فی ثلاثین رجلاً من المھاجرین لیعترض لعیرات قریش ۔

واقدی نے اپنے خیال کے مطابق یہ بیان کیا ہے کہ رسول خدا نے اسی سال (سال اول) ماہ رمضان میں ہجرت کے سات مہینے بعد حمزہ بن عبد المطلب کے لیے ایک علم آراستہ کیا جس کا پھریرا سفید تھا مہاجرین میں سے تیس آدمیوں کے ساتھ تاکہ قریش کے تجارتی قافلوں کا راستہ روکیں ۔

(٢) وان رسول اللہ عقد ایضاً فی ھذہ السنۃ علی راس ثمانیۃ اشھر من مھاجرہ فی شوال لعبیدۃ بن الحارث بن عبد المطلب بن عبد مناف لواء ابیض وامرہ بالسیر الی بطن رابغ ۔

اور رسول خدا نے اسی سال ہجرت کے آٹھ مہینے بعد ماہ شوال میں عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب بن عبد مناف کے لیے بھی ایک سفید جھنڈا مرتب کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ رابغ کی وادی کی طرف جائیں ۔

(٣) وفیھا عقد رسول اللہ لسعد بن ابی وقاص الی الخزار

اور اسی سال ذی قعدہ میں رسول خدا نے سعد بن ابی وقاص کے لیے ایک سفید جھنڈا

لواءٌ ابیض یحملہ المقداد بن عمرو فی ذی القعدۃ

مرتب کیا خزاز کی طرف جانے کے لیے جسے مقداد بن عمرو نے اٹھایا۔

ابن اسحاق کو ان مہموں سے جو واقدی نے ہجرت کے پہلے ہی سال بتائی ہیں اختلاف ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت نے ہجرت کے بعد پہلے سال کے اختتام تک کوئی نقل و حرکت نہیں فرمائی۔ بیشک دوسرے سال کے ماہ صفر میں آپ جنگ کے لیے نکلے اور یہی غزوہ ودان یا ابوا رہے جس میں جنگ کی نوبت نہیں آئی اور قبیلۂ بنو ضمرہ نے آپ کی اطاعت کرلی پھر ایک مہینے کے وقفہ سے ماہ ربیع الاول میں عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب کو ساٹھ یا اسّی سواروں کے ساتھ جو سب مہاجرین میں سے تھے اور ان میں کوئی انصاری نہ تھا روانہ فرمایا اور ان کی مشرکین قریش کی ایک بڑی جماعت سے جس کا سردار عکرمہ بن ابی جہل تھا مڈبھیڑ ہوئی مگر پھر جنگ نہیں ہونے پائی لیکن سعد بن ابی وقاص نے ایک تیر مارا اور یہ پہلا تیر ہے جو اسلام میں لگایا گیا ہے۔ پھر آپ نے حمزہ بن عبدالمطلب کو تیس مہاجرین کے ساتھ سیف البحر کی طرف بھیجا ان میں بھی کوئی انصاری نہ تھا اُدھر سے ابوجہل تین سو سواروں کے ساتھ آرہا تھا۔ اس موقع پر قبیلۂ بنی جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو نے جو غیر جانب دار تھا بیچ بچاؤ کردیا اور پھر جنگ نہیں ہوئی پھر ماہ ربیع الثانی میں خود رسول خدا قریش کی فکر میں نکلے اور مقام بواط تک جو کوہ رضوی کے اطراف میں ہے

تشریف لے جاکر مراجعت فرمائی۔ پھر جمادی الاول میں آپ قریش سے جنگ کے لیے نکلے اور گھومتے پھرتے مقام عشیرہ میں جو بطن ینبع میں ہے جمادی الثانی کے کچھ دن گزرنے تک قیام فرمایا پھر مدینہ واپس ہوئے اس کے بعد دس دن سے کم عرصہ نہ گزرا تھا کہ کرز بن جابر فہری نے مدینہ کے مویشیوں پر جو چر رہے تھے چھاپہ مارا اور لوٹ کر لے گیا۔ پیغمبرؐ کو معلوم ہوا تو آپ اُس کے تعاقب کے لیے نکلے مگر وہ ہاتھ نہیں آیا اسے غزوۂ بدر اولیٰ کہتے ہیں۔ اس کے بعد جمادی الثانی اور رجب اور شعبان میں آپ سکون کے ساتھ مدینہ میں تشریف فرما رہے[1]۔

اس دوران میں جمادی الثانی کی آخری تاریخ جس میں رجب کی پہلی ہونے کا بھی شبہہ تھا عبداللہ بن جحش کی قیادت میں چند مسلمانوں نے قریش کے ایک قافلہ پر حملہ کیا جس میں عمرؔ بن حضرمی اور دوسرے قریش کے چند آدمی قتل ہوئے اور ان کے اموال مسلمانوں کے قبضے میں آئے۔

ان کے اس عمل کو پیغمبر اسلامؐ نے ناپسند فرمایا اور اُدھر قریش نے آپ کے خلاف یہ پروپیگنڈا برپا کیا کہ یہ محترم مہینوں کے تقدس پر بھی عامل نہیں اور بس اس کے بعد ابوسفیان والا بڑا تجارتی قافلہ شام گیا اور پیغمبر اسلامؐ اور آپ کے ساتھ والے مسلمانوں نے اُس پر بھی حملے کا ارادہ کیا جس کی خبر ابوسفیان نے مکہ بھیج دی تو وہاں سے قافلہ کی حفاظت کے لیے فوج روانہ ہوئی جس سے مسلمانوں کی جماعت کا

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۹ تا صفحہ ۲۶۱

تصادم ہوگیا۔ اسی کو جنگ بدر کہتے ہیں۔

پھر اس جنگ بدر کے ذیل میں بار بار اس عمرو بن حضرمی کا نام آتا ہے کبھی اُس وقت کہ جب ابوسفیان کا بھیجا ہوا آدمی مکہ پہونچا تو اُس وقت مکہ والوں نے کہا کہ کیا عمرو بن حضرمی کا جیسے خون بہا لیا گیا ویسے ہی ہمارے ہر قافلہ کے آدمیوں کا خون بہا یا جائے گا اور کبھی اُس وقت جب ابوسفیان کے قافلہ کے صحیح سلامت مکہ میں واپس پہونچنے کی اطلاع آگئی اور کچھ امن پسندوں نے یہ تحریک چلائی کہ اب فوج کو واپس چلا جانا چاہیے تو لوگوں نے حکیم بن حزام سے کہا کہ تم اپنے حلیف عمرو بن حضرمی کے خون سے درگزر کر دو اور واپس چلو اس پر وہ تیار بھی ہوگیا مگر ابوجہل نہ مانا اور اُس نے کہا کہ ہم یوں واپس نہیں ہوں گے[1]۔ یہ ہے وہ انداز بیان جہاد اسلامی کے آغاز کا جو قدیم مورخین نے اختیار کیا ہے۔

خیر! پرانے زمانہ کے مورخین اس غلط انداز بیان کو اختیار کرتے تو قابل تعجب نہ تھا جب واقعات پر درایتی نقطۂ نظر سے تبصرہ نہ ہوتا تھا لیکن غضب کی بات یہ ہے کہ دور حاضر کے اہل قلم جب کہ تاریخ کے ابن خلدونی نظریہ کا چرچا اُن کی زبان پر بہت آتا ہے وہ بھی پیغمبرؐ کے ابتدائی موقف کو غلط ہی طور پر پیش کرتے ہیں اور درایت کے ان پہلوؤں پر نظر نہیں کرتے جو قطعی طور پر اسے غلط ثابت کرتے ہیں

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۶

مثلاً عبدالباری ایم۔ اے اپنے مقالہ "رسول کریمؐ کی جنگی اسکیم" میں یوں لکھتے ہیں کہ :۔

"مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام حفاظت خود اختیاری کی تدبیر تھی اس بنا پر آنحضرتؐ کا ایک کام تو یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں۔ دوئم یہ کہ یمن سے شام کی تجارتی شاہراہ پر اپنی گرفت مضبوط کر لیں تاکہ قریش اور دوسرے قبائل جن کا مفاد اس راستے سے وابستہ تھا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی معاندانہ اور مزاحمانہ پالیسی پر نظرثانی کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔ اس مسئلہ پر آنحضرتؐ نے دو اہم تدابیر اختیار کیں۔ ایک مدینہ اور ساحلِ بحر احمر کے درمیان اس شاہراہ سے متصل جو قبائل آباد تھے اُن کے ساتھ گفت و شنید شروع کی تاکہ وہ حلیفانہ اتحاد یا کم از کم ناطرفداری کے معاہدے کر لیں۔

(۲) قریش کے قافلوں کو دھمکی دینے کے لیے اس شاہراہ پر پیہم چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنا شروع کیے۔ ان تاختوں کا اصل مقصود قریش کو ہوا کا رخ بتانا تھا لہٰذا ان تمام مہموں میں نہ تو کشت و خون ہوا اور نہ کوئی قافلہ لوٹا گیا۔ نہ ان میں حضورؐ نے اہل مدینہ کا ہی کوئی آدمی بھیجا۔ تمام دستے خالص مکی مہاجرین ہی سے مرتب فرماتے رہے تاکہ حتےٰ الامکان کشمکش قریش کے اپنے ہی گھر والوں تک محدود رہے اور دوسرے قبیلوں کے اس میں

اُلجھنے سے آگ نہ پھیل جائے۔"

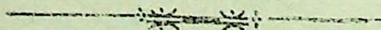
اس میں دیکھیے کہ چاہے کتنا ہی گھما پھرا کر اور صفائی کی کوشش کرتے ہوئے بات کہی گئی ہو مگر بات یہی نکلتی ہے کہ پیغمبرؐ نے مکہ کے تجارتی قافلوں پر تاختیں شروع کیں اور اب چاہے خود ان تاختوں میں بقول مقالہ نگار کے کوئی خونریزی نہ ہوئی ہو مگر جب کہ یہی تاختیں سبب قرار پاتی ہیں آئندہ کے بڑے تصادمات کا تو ان معرکوں میں جتنی بھی خونریزی ہوئی ہو ذمہ داری اُس کی پیغمبر اسلامؐ ہی پر عائد ہوتی ہے۔

مگر ہمارے نزدیک عقلی طور پر وہ استدلال ناقابل تزلزل ہے کہ جب پہلا بڑا معرکہ بدر کا پیش آیا تو پیغمبر اسلامؐ کے پاس نہ لڑنے کے لیے تلواریں تھیں اور نہ سوار ہونے کے لیے گھوڑے تھے۔ جس کے پاس جنگ کا سامان ہی نہ ہو وہ کبھی ایک جنگجو قوم کے خلاف جو پورے طور پر مسلح ہو اس قسم کا اقدام نہ کرے گا جسے تاخت سے تعبیر کیا جائے۔

ہمارے نزدیک بدر سے پہلے جتنی آویزشیں ہیں اُن کی نوعیت پیغمبرؐ کی جانب سے کسی تاخت کی ہرگز نہیں تھی بلکہ چھوٹے چھوٹے دستے اہل مکہ ہی کے آتے تھے اور وہ مدینہ کی سرحد پر کچھ اپنی طاقت کی نمائش کر جاتے تھے جن میں سے ایک تاخت کرنے والی جماعت کے

لہ دعوت دہلی "سیرت طیبہ" ١٦ ستمبر ١٩٥١ء۔

سرگروہ کرز بن جابر فہری کا نام تاریخ میں بھی آگیا ہے کہ اس نے مدینہ کے مویشیوں پر جو چر رہے تھے چھاپہ مارا اور انھیں لوٹ کر لے گیا۔ بس ایسی ہی صورت دوسرے گردستوں کی طرف سے بھی ہوتی تھی۔ اس کی پیغمبر اسلام کو جب خبر ملتی تھی تو کبھی خود کچھ جمعیت کو لے کر چلے جاتے تھے اور کبھی کسی دوسرے سردار کی سرکردگی میں چند آدمیوں کو ان کی مدافعت کے لیے بھیج دیتے تھے جن میں اکثر ایسا ہوا کہ وہ حملہ آور نہیں ملے اس لیے کہ وہ کچھ لوٹ مار کر کے واپس چلے گئے تھے لہذا کسی خونریزی کی نوبت نہیں آئی اور دو ایک دفعہ اس جماعت کے کچھ افراد کا سامنا ہو گیا تو تصادم کی نوبت آئی چنانچہ عمرو بن حضرمی اور اس کے کچھ ساتھیوں کا قتل ایسی ہی ایک آویزش میں واقع ہوا اور آخر میں مکہ والوں کی بڑی فوج مدینہ پر حملے کے لیے آئی تو جنگ بدر کا خونریز معرکہ پیش آیا۔ اسی بنا پر قرآن کہہ رہا ہے کہ "اُن لوگوں کو جن سے جنگ کی جا رہی ہے اب اجازت دی جاتی ہے کہ وہ مقابلہ کریں" اگر چھیڑ مسلسل مسلمانوں کی طرف سے ہو رہی ہوتی تو "جنگ کی جا رہی ہے" کہنے کے کوئی معنی نہ تھے بلکہ "جنگ کر رہے ہیں" کہا جاتا جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، قرآن کی یہ صراحت اور اس پر مخالف طبقہ کی طرف سے کوئی احتجاج نہ ہونا اس کا قطعی ثبوت ہے کہ اسباب جنگ مسلمانوں کے کسی عمل سے متعلق نہ تھے۔



جنگ بدر

بدر ایک کنویں کا نام تھا جو قبیلۂ غفار کے بدر نامی ایک شخص کی ملکیت تھا[۵۱]، چونکہ یہ جنگ اس کنویں کے قریب ہوی تھی اس لیے اس غزوہ کا نام جنگ بدر رہوا۔ یہ جنگ ہجرت نبوی کے اُنیس[۱۹] مہینے بعد ۱۷ یا ۱۹ ماہ رمضان کو ہوی ہے[۵۲]، دن جمعہ کا تھا[۵۳]۔ چونکہ یہ جنگ ماہ رمضان میں ہوی تھی اس لیے پیغمبرؐ اس سال اعتکاف کی عبادت انجام نہیں دے سکے جس کے عوض میں دوسرے سال حضرت نے ماہ رمضان میں بیس دن اعتکاف فرمایا۔ دس دن اس سال کے اور دس دن گزشتہ سال کی قضا کیے[۵۴]۔

اس جنگ کا سروسامان شاہ عبدالحق دہلوی نے یہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں صرف تین گھوڑے تھے اور ستر اونٹ اور چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں۔ سواری ہونے کی صورت یہ تھی کہ ایک ایک اونٹ دو دو یا تین تین آدمیوں میں مشترک تھا جس پر ہر ایک باری باری سوار ہوتا تھا۔ یہاں بھی حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کو یہ خصوصیت خاص حاصل تھی کہ آپ حضرت پیغمبر خداؐ کے شریک تھے۔

جب حضرت رسولؐ کے پیادہ ہونے کی	چوں نوبت پیادہ شدنِ حضرتؐ

[۵۱] اعلام الوری
[۵۲] اعیان الشیعہ جلد ۲ صـ ۱۵۲
[۵۳] سیرت ابن ہشام جلد ۱ صـ ۱۵۳
[۵۴] فقہ الرضاؑ مطبوعہ طہران صـ ۲۱

می رسید، می گفتند تو سوار شو یا رسول اللہ ما در رکاب تو پیادہ می رویم می فرمود نیستید شما قوی تر از من و نیستم من بے نیاز تر شما از اجر۔

(مدارج النبوۃ)

باری آتی تھی تو حضرت علیؓ کہتے تھے آپ سوار ہوں یا رسول اللہؐ ہم آپ کے ہمراہ رکاب پیادہ چلیں گے، رسولؐ فرماتے تھے کہ نہ تم لوگ مجھ سے قوت میں زیادہ ہو اور نہ میں تم سب سے زیادہ اجر و ثواب سے بے نیاز ہوں۔

بعض لوگوں نے سات اونٹ اور دو گھوڑے بتائے ہیں[1]۔

سبب جنگ

جہاں تک واقعات پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے جنگ بدر کی پوری ذمہ داری صرف دو شخصوں پر ہے۔ ایک بنی اُمیہ کا سردار ابو سفیان اور دوسرا ابو جہل۔ اس کے پہلے جیسا کہ گزشتہ اوراق میں لکھا گیا ہے مکہ کے لوگ چھوٹے چھوٹے دستوں کی شکل میں آکر مدینہ کے اطراف میں کچھ لوٹ مار کیا کرتے تھے مگر عام باشندگانِ مکہ کسی بڑے حملے کے لیے جو جنگ کی حیثیت رکھتا ہو تیار نہ تھے، مگر اس موقع پر صورتِ حال یہ ہوئی کہ ابو سفیان ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ لے کر جس میں اکثر رؤسائے مکہ کا تجارتی سامان تھا مکہ گیا ہوا تھا، اس نے اہل مکہ کو پیغمبر اسلامؐ سے جنگ پر آمادہ کرنے کے لیئے ابو جہل کے پاس یہ اطلاع بھیج دی کہ ہمارا قافلہ خطرہ میں ہے اور مدینہ والے مسلمان

---

[1] مسلمانانِ عالم حصہ اول صفحہ ۴

اس پر حملہ کرکے تمام سامان لوٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس پر ابوجہل نے مکہ میں اس خطرہ کا اعلان کر دیا۔

مسٹر کے۔ کے حمید نے شاید ابوسفیان کو بچانے کے لیے پوری ذمہ داری ابوجہل پر ڈال دی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"لوگوں کو برانگیختہ کرنے کے لیے مکہ میں ابوجہل نے اعلان کیا کہ اہل مکہ کا جو تجارتی قافلہ شام سے واپس آ رہا ہے مسلمانوں نے اُسے لوٹ لینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے، وہ لوگ جن کا مال و اسباب اس قافلہ میں تھا بہت برہم ہوئے اور جوش میں آ کر ان سب نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔ ایک ہزار آدمی، سات سو اونٹ اور تین سو گھوڑے جنگ کے لیے تیار کیے گئے۔ باوجودیکہ وہ قافلہ جس کی وجہ سے لوگوں کو بھڑکا کر جنگ کے لیے آمادہ کیا گیا تھا صحیح و سالم مکہ پہونچ گیا مگر ابوجہل نے جو فوج کا سپہ سالار تھا چالاکی سے فوج کو اس کا علم نہ ہونے دیا[۱]"

عبدالباری صاحب ایم۔ اے نے باوجودیکہ جنگ بدر کے قبل کی چھوٹی چھوٹی آویزشوں کی نوعیت سمجھنے اور سمجھانے میں غلطی کی ہے اور طاقت کی نمائش کی پوری ذمہ داری پیغمبر اسلام اور مسلمانوں پر ڈال دی ہے مگر خاص جنگ بدر کے سلسلہ میں انھوں نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اور لکھا ہے:۔

---

[۱] مسلمانان عالم صفحہ ۳۶۷

"حالانکہ شام کو جاتے وقت جب اس قافلہ کا گزر مدینہ کی طرف ہوا تو کوئی حملہ نہ ہوا تھا مگر جب واپسی کا ارادہ کیا تو ابو سفیان نے دیکھا کہ ساتھ میں پچاس ہزار اشرفی کا مال ہے اور محافظ صرف تیس چالیس۔ اس لیے اس نے اپنی قیاس آرائی پر شعبان سنہ ۲ھ میں ضمضم ناقہ سوار کو مکہ دوڑا دیا کہ یہ خبر دے دو کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اس لیے مدد کرو۔ ادھر قریش تو پہلے سے بھرے بیٹھے تھے، جب یہ افواہ پہنچی تو اس نے بارود میں چنگاری کا کام کیا بس شعلہ بھڑک اُٹھا۔"

قرآن مجید میں سورۂ انفال میں جو اس موقع کا تذکرہ ہے وہ بھی صاف بتا رہا ہے کہ مسلمان صرف تجارتی قافلہ کی خبر سُن کر روکنے کے لیے نہیں نکلے تھے بلکہ یہ اطلاع آ چکی تھی کہ مکہ کی فوج مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے آ رہی ہے اور اس بنا پر روانگی کے وقت ہی خوف و دہشت کی کیفیت چھائی ہوئی تھی اور بہت سے لوگ مقابلہ پر جانے سے جی چرا رہے تھے۔ ہاں کچھ خام خیال ایسے بھی تھے جو یہ سوچ رہے تھے کہ خدا کرے فوج کے آنے کی خبر غلط ہو اور وہ تجارتی قافلہ ہی ہماری زد پر آ جائے اور ان اموال پر قبضہ ہو جائے۔ یہ تمام باتیں قرآن کی اس آیت سے صاف نمایاں ہیں:۔

وان فریقا من المؤمنین لکارھون ٥ یجادلونك	مسلمانوں میں سے ایک گروہ ناگواری محسوس کر رہا تھا، وہ آپ سے حق کے

فی الحق بعد ما تبیّن
کانما یساقون الی
الموت وھم ینظرون ٥
واذ یعدکم اللہ احدی
الطائفتین انّھا لکم
وتودّون انّ غیر ذات
الشوکۃ تکون لکم و
یرید اللہ ان یحقّ الحقّ
ویقطع دابر الکافرین
لیحقّ الحقّ ویبطل الباطل
ولوکرہ المجرمون ٥

بارے میں جھگڑ رہے تھے بعد اس کے کہ وہ ظاہر ہو چکا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت کی طرف کھینچ کر لے جائے جا رہے ہیں جب کہ وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب اللہ نے اطلاع دی تھی کہ دونوں گروہوں میں سے ایک سے تمھاری مڈبھیڑ ہوگی اور تم لوگ آرزومند تھے کہ وہ جو قوت وطاقت نہیں رکھتا تم لوگوں کے حصہ میں آئے اور اللہ چاہتا تھا کہ حق کو قائم کرے اور کافروں کا قلع قمع کرے، تاکہ وہ حق کو حق کردے اور باطل کو باطل کردے چاہے مجرم لوگ ناپسند کریں۔

اس آیت میں حسب ذیل باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) اگر تجارتی قافلہ کو لوٹنے کے ارادہ سے روانگی ہو رہی تھی تو خوف واضطراب اور پہلو تہی کس بنا پر تھی اور یہ کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ موت کے منھ میں جا رہے ہیں؟ اس خوف ودہشت کی کیفیت سے ظاہر ہے کہ مشرکین کی فوج، اس کی کثرت تعداد اور اس کے اسلحہ وغیرہ کی تیاری یہ سب معلوم ہوگئی تھی اور اپنی جماعت کی بے سروسامانی اور قلت تعداد بھی سامنے تھی اور یہی وہ بحث ہو سکتی ہے جو لوگ رسولؐ سے کرتے تھے، جیسے ارشاد کیا گیا کہ

وہ آپ سے جھگڑ رہے تھے حق کے بارے میں اس کے نمایاں ہونے کے بعد، یہ حق حکم الٰہی تھا جس کا علم ہونے کے بعد کسی مسلمان کو پھر بحث اور رد و کد کی گنجائش نہیں ہے۔

(۲) خالق نے اطلاع دے دی تھی کہ دونوں گروہوں میں سے ایک کا تمھارا سامنا ہوگا، اس سے ظاہر ہے کہ ایک طرف سے قافلہ آرہا ہے اور دوسری طرف سے سپاہیوں کا لشکر یعنی اس فوج کی روانگی مسلمانوں کے عزم سفر اور کسی حملے کے ارادہ پر مبنی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کو روانگی کا حکم اس فوج کے قریب مدینہ پہونچ جانے کے بعد ہوا تھا۔

(۳) "تم لوگ یہ خواہش رکھتے تھے کہ وہ جس میں طاقت و قوت نہیں ہے تمھارے سامنے آئے" یہ کچھ طمع رکھنے والے مسلمانوں کے تصورات کی ترجمانی ہے جو اس صورت حال کو سامنے رکھ کر کہ ایک طرف سے قافلہ آرہا ہے جس میں سامان تجارت ہے، کچھ یہ سوچنے لگا تھا کہ ممکن ہے ہمارا سامنا اس قافلہ کا ہوجائے تو بڑے اموال ہاتھ آئیں گے۔ یہ طمع کی ذہنیت مسلمانوں کے ایک طبقہ میں شروع سے پائی جارہی تھی جسے قرآن نے بطور مذمت نمایاں کیا ہے اور اس مذمت سے یہ ظاہر ہے کہ خدا اور رسول کی جانب سے کبھی بھی کسی تجارتی قافلہ پر حملہ کے لیے مسلمانوں کو آمادہ نہیں کیا گیا اور نہ اس کی کبھی ہمت افزائی کی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ خالق کے تنبیہی تازیانہ کے باوجود یہ ذہنیت اموال لوٹنے کی ایک بڑے طبقہ میں موجود رہی چنانچہ وہی پھر اس کے

بعد جنگ احد میں اُس تباہ کن صورت حال کی باعث ہوئی تھی جس کے بعد بظاہر اسباب مسلمانوں کی مختتم طور پر شکست یقینی ہو گئی تھی جس کی تفصیل اُحد کے حالات میں آئے گی۔

پھر اس سورہ میں کفار قریش کی طرف جو مکہ سے لڑنے کے لیے بدر میں آئے اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرًا و رئاء الناس ویصدون عن سبیل اللہ ؕ	اور اُن لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ طور پر اور لوگوں کو اپنی شان دکھانے کے لیے نکلے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کو روکنے کے لیے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور رعب جمانے کے لیے نکلے تھے اور وہ خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے تھے۔ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے تھے جس سے مقصود اپنے زور و قوت کا اعلان اور اسلام کی ترقی کا روکنا تھا۔

افسانۂ غارت گری کی بنیاد

قرآنی روایت اور عقلی درایت دونوں قطعی حیثیت رکھتی ہیں پھر بعض وقت حیرت ہوتی ہے کہ کسی غیر مسلم حلقہ میں نہیں بلکہ خود مسلم حلقوں میں واقعۂ بدر کا پس منظر یہ کیوں قرار دے دیا گیا کہ رسولؐ

ابوسفیان کے قافلہ کو لوٹنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے تھے مگر یہ حیرت دور ہو جاتی ہے حافظ ابن جریر طبری کی تاریخ پڑھ کر جس سے سب کچھ سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ حکایت کیوں بنی اور کس وجہ سے پھیلی۔

تاریخ کے ہر طالب العلم کو یہ معلوم ہے کہ خوش نصیبی یا بدنصیبی سے مسلمانوں کے تخت و تاج کے مالک ۳۰-۴۰ برس تک ابوسفیان کے وارث رہے جو پیغمبر کے خلاف اس خونریز جنگ کے سلسلہ کا بانی تھا جس کی پہلی کڑی جنگ بدر تھی۔ اور پھر ۵۰-۶۰ برس تک اسی قبیلہ کی دوسری شاخ کے افراد رہے۔ طبری نے "ذکر وقعۃ بدر الکبریٰ" کی سرخی قائم کر کے سب سے پہلی روایت جو جنگ بدر کے تفصیلات کے متعلق درج کی ہے اور جو بنیادی حیثیت رکھتی ہے یعنی درمیان درمیان دوسری روایتیں کچھ جزئی واقعات کے سلسلہ میں لائی گئی ہیں۔ مگر واقعہ کے پورے پس منظر پر مشتمل جو روایت ہے وہ یہی ہے۔ اس کی شان نزول اپنے سلسلۂ سند کے ساتھ طبری نے یہ درج کی ہے کہ:-

هشام بن عروة عن عروة انه کتب الی عبد الملک بن مروان اما بعد فانك کتبت الیّ فی ابی سفیان و مخرجه تسألنی کیف کان شانه کان من شانه انّ ابا سفیان بن حرب اقبل

ہشام بن عروہ نے اپنے باپ عروہ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے عبدالملک بن مروان کو خط لکھا جس میں ابتدائی آداب و تسلیمات کے بعد لکھا تھا کہ آپ کا خط میرے پاس آیا ابوسفیان اور ان کے روانہ ہونے کے بارے میں۔ آپ مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ اس کا واقعہ کیا تھا تو اس کا واقعہ یہ تھا کہ ابوسفیان بن حرب

من الشام فی قریب من سبعین راکباً من قبائل قریش کلھا کانوا تجاراً بالشام فاقبلوا جمیعاً معھم اموالھم وتجارتھم فذکروا الرسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم واصحابہ الخ۔[1]

شام سے روانہ ہوئے تقریباً ستر سواروں کے ساتھ جو قریش کے تمام قبیلوں میں سے تھے، وہ سب شام میں تجارت کرتے تھے تو وہ سب آرہے تھے اور اُن کے ساتھ اُن کے تجارتی اموال تھے تو یہ خبر رسول خدا اور اُن کے اصحاب کو پہونچی۔

اب ہر شخص جو غور کرے وہ اس کی پوری نوعیت کو سمجھ سکتا ہے۔ عبدالملک اسلامی خلیفہ کی حیثیت سے تخت حکومت پر ہے مگر وہ عروہ بن زبیر سے پیغمبر اسلامؐ کی روانگی کا حال نہیں پوچھ رہا ہے، بلکہ ابوسفیان کی روانگی کی کیفیت دریافت کر رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُسے دلچسپی اس وقت اپنی خاندانی تاریخ سے ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں جنگ بدر کی روداد جس طرح اب تک زبان زد خلق ہے، اُس سے بنی اُمیہ کے سرگروہ ابوسفیان کا کردار جس طرح مجروح ہو رہا ہے اُسے اس کے متعلق فکر ہے اور اس کے لیے اُس نے منتخب کیا ہے ایک ایسے واقعہ نگار کو جو ان واقعات کو اس طرح سے درج کرے کہ ابوسفیان کا دامن بے داغ نظر آئے اور اس کے

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۶۷

بجائے پورا الزام پیغمبر اسلامؐ اور اُن کے اصحاب پر عائد ہو جائے۔ ہم آج تیرہ سو برس کے بعد اس مقصد کو بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں تو عین اُس وقت وہ واقعہ نگار جس سے یہ خواہش کی جا رہی تھی اس مقصد کو کس طرح نہ سمجھتا جب کہ وہ حکومت کا منظور نظر ہونے کی وجہ سے یقیناً اس حکومت کے سابقہ احسانات کا بار بھی اپنے کاندھوں پر محسوس کرتا تھا اور آئندہ کے توقعات بھی اُس کے سامنے تھے اور مرضیِ حکومت کے خلاف قلم کو گردش دینے میں اندیشوں کا ہونا بھی بعید نہیں ہے، اس بنا پر اُس نے بادشاہ وقت کے منشا کے مطابق جو کچھ اُس سے ہو سکتا تھا اُس کا حق ادا کر دیا، چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

"ابو سفیان تقریباً ستر سواروں کے ساتھ قبائل قریش میں سے جو سب کے سب شام میں تجارت کرتے تھے اموال تجارت لیے ہوئے روانہ ہوا اور اُس کی خبر پیغمبر اسلامؐ کو پہونچی اور ان کے درمیان اس کے پہلے جنگ ہو چکی تھی اور کچھ لوگ قتل ہو چکے تھے اور ابن حضرمی کچھ ساتھیوں کے ساتھ قتل کیا جا چکا تھا، اور قریش کے کچھ آدمی بھی قتل ہو چکے تھے۔"

آپ سمجھ رہے ہیں؟ یہ پس منظر کس طرف کے اقدامات کو نمایاں کر رہا ہے؟ یعنی پیغمبر اسلامؐ یہ سب خونریزی پہلے کر چکے تھے۔ اب اس اسلامی مورخ کو کیا کہا جائے کہ وہ یہ کہتا ہے اور قرآن جنگ بدر کے موقع پر اعلان کر رہا ہے کہ اب اِن کو جنگ کی اجازت دی جاتی ہے"

اس لیے کہ ان سے جنگ کی جا رہی ہے اور ان پر ظلم ہوا ہے، یعنی قرآن جنگ کی ذمہ داری مشرکین قریش پر ڈال رہا ہے اور یہ قرآن پر ایمان کا دعوے دار مورخ جنگ کی ذمہ داری خود رسولؐ اور مسلمانوں پر ڈالتا ہے۔ اب یہ اس وقت کے مسلمانوں کو طے کرنا ہے کہ وہ قرآن کے بیان کو سچ مانیں گے یا اس مورخ کے بیان کو جو بنی اُمیہ کی خاطر یہ روایت سُنا رہا ہے؟!

پھر جناب عروہ بن زبیر تحریر فرماتے ہیں :-

"یہی واقعہ (یعنی کفار قریش مثلاً ابن حضرمی وغیرہ کا قتل ہونا) رسول خداؐ اور قریش کے درمیان جنگ کا باعث ہوا، اور یہ ابوسفیان اور اُن کے ساتھیوں کے شام کی جانب روانہ ہونے سے پہلے ہو چکا تھا، پھر ابوسفیان جب واپس ہو رہے تھے قریش کے اُن تاجروں کے ساتھ تو ان لوگوں نے دریا کے کنارے کا راستہ اختیار کیا، جب رسول اللہؐ نے اُن کا حال سُنا تو آپ نے اپنے اصحاب کو بُلایا اور اُن سے بیان کیا کہ ان لوگوں کے ساتھ اتنے کثیر اموال ہیں اور اُن کی تعداد اتنی کم ہے۔"

دیکھ رہے ہیں آپ وہ تصویر بدر ایسے اسلامی جہاد کی جو اموی مورخ کھینچ رہا ہے؟ اور قرآن نے تو مسلمانوں کی طرف مذمت کے انداز میں یہ نسبت دی ہے کہ تم لوگ تجارتی قافلہ کا تصور باندھے ہوئے جا رہے تھے کہ شاید اُس کا سامنا ہو جائے، اور یہ واقعہ نگار صاف

صاف پیغمبرؐ کی طرف یہ نسبت دے رہا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو اموال قریش کی کثرت کا سبز باغ دکھا کر اور اُن کی قلت تعداد کا تذکرہ کر کے گویا "ایک نرم چارا" دکھاتے ہوئے روانہ ہونے کی دعوت دی۔

اتنے ہی پر بس نہیں بلکہ خلیفۂ اموی کی خاطر مورخ اس پہلو پر زور دے رہا ہے کہ:۔

فخرجوا لا یریدون الا ابا سفیان والرکب معہ لا یرونہا الا غنیمۃ لھم لا یظنون ان یکون کبیر قتال اذا لقوھم۔

وہ لوگ نکلے اس عالم میں کہ سوا ابوسفیان اور اس کے ساتھ کے سواروں کے کچھ اور اُن کا مقصد نہ تھا۔ بس وہ اپنے لیے لقمۂ تر سمجھ رہے تھے اور انھیں یہ خیال نہیں تھا کہ کوئی بڑی جنگ ہوگی۔

اب یاد کیجیے قرآن کا وہ بیان کہ مسلمان پیغمبرؐ سے بحث کر رہے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ موت کے منھ میں بھیجے جا رہے ہیں جب کہ وہ اُسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد بھی کیا کوئی شک کیا جا سکتا ہے اس میں کہ عروہ کو حقیقت نگاری سے کوئی مطلب نہیں ہے اور صرف بادشاہ وقت کی فرمائش کی تعمیل کرنا ہے اور اُس کے جذبات کا احترام۔ اور آگے چلیے، عروہ رقم طراز ہیں:۔

"ابوسفیان کو یہ خبر پہونچی کہ پیغمبر خدا کے اصحاب اُن سے

تعرض کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے مکہ کے اہل قریش کے پاس آدمی بھیجا کہ محمدؐ اور اُن کے اصحاب تمھارے قافلہ کو روکنا چاہتے ہیں اس لیے اپنے سامانِ تجارت کی خبر لو تو جب قریش کو یہ خبر پہنچی اور ابو سفیان کے قافلہ میں قریش کے ہر خاندان کا ایک آدمی موجود تھا تو انھوں نے جنگ کے لیے لشکر مرتب کیا اور چل کھڑے ہوئے"

پھر یاد کیجیے قرآن کا وہ بیان کہ مسلمان جب روانہ ہوئے تو اُسی وقت ایک طرف سے قافلہ آرہا تھا اور ایک طرف سے مسلّح فوج اور مسلمانوں کو یہ اطلاع دے کر روانگی پر آمادہ کیا گیا تھا کہ تمھارا سامنا ان میں سے ایک سے ہوگا۔ اب امتحان ہے قرآن پر ایمان اور بنی اُمیہ سے وفاداری کا! سلاطین بنی امیہ سے وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کے مورخ کی بات کو صحیح مانا جائے اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن کی بات کو۔ افسوس یہ ہے کہ سوادِ اعظم کے مورخین نے زیادہ پہلے ہی رُخ کی طرف رجحان رکھا ہے اور دوسرے پہلو کو نظر انداز کیا ہے یا دبا دیا ہے۔

اب پھر یاد کر لیجیے کہ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اللہ نے تم کو اطلاع دی تھی کہ دونوں گروہوں میں سے ایک سے تمھارا سامنا ہوگا، اب اسے خواہ کوئی مذہبی نقطۂ نظر سے مانے کہ خالق نے بذریعۂ وحی رسولؐ کو اطلاع دی تھی مگر چونکہ قرآن نے تمام مسلمانوں سے خطاب

کر کے "یعِدُکُم" کہا ہے کہ اللہ تم لوگوں سے وعدہ کر رہا تھا، اس لیے ماننا پڑے گا کہ پیغمبرؐ نے اس کی اطلاع مسلمانوں کو دے دی تھی اور یا مادّی سلسلۂ اسباب کو پیش نظر رکھنے والے اللہ کے اطلاع دینے کے یہ معنی قرار دیں کہ اُس کی طرف سے یہ انتظام ہوا کہ مخبروں نے یہ خبر دے دی کہ ایک طرف سے قافلہ آ رہا ہے اور ایک طرف سے فوج۔ بہر صورت قرآن یہ صاف کہہ رہا ہے کہ یہ اطلاع روانگی کے قبل آ گئی تھی مگر بنی امیہ کی خاطر سے قلم اُٹھانے والا مؤرّخ (عروہ بن زبیر) اس پر زور دے رہا ہے کہ :-

ولم یسمع بنفرۃ قریش رسول اللہؐ و لا اصحابہ حتی قدم النبیؐ بدراً۔

رسول خداؐ یا اُن کے اصحاب نے قریش (فوج) کے روانہ ہونے کی خبر اُس وقت تک نہیں سُنی تھی جب تک کہ آپ بدر کے مقام پر پہونچ نہیں گئے۔

اب اس مؤرّخ کو تو تمام چولیں بٹھانا ہیں، اس لیے اُسے خیال ہوا کہ کہیں بدر کا جغرافیائی محل وقوع میرے مقصد کے خلاف نتیجہ نہ دے اس لیے کہ وہ تو مدینہ اور مکہ کے بیچ میں ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ پیغمبرؐ مکہ سے آنے والی فوج ہی کو روکنے کے لیے نکلے ہیں، اس لیے دفع دخل کے طور پر وہ کہتا ہے کہ :-

"بدر قریش کے قافلہ کے راستے میں اُس وقت پڑتا تھا جب وہ

سلہ طبری جلد ۲ ص۲۶۸

ساحل کے راستے شام کی طرف جائیں یا داپس ہوں مگر ابوسفیان کو چونکہ اطلاع پیغمبر کے روانہ ہونے کی پہونچ گئی اس لیے وہ بدر کو چھوڑ کر بالکل دریا کے کنارے کنارے مکہ چلے گئے اور رسول نے بدر کے قریب رات کو قیام کیا اور زبیر بن عوام اور کچھ اپنے اصحاب کو بدر کے کنوئیں کے پاس بھیجا۔"

پھر وہ کہتا ہے :-

"اور ان لوگوں کو بالکل خبر نہ تھی کہ قریش کی فوج ان کے پیچھے روانہ ہوئی ہے ۔ یہاں پیغمبر نماز پڑھنے کھڑے ہوئے، اس اثنا میں قریش کے کچھ پانی بھرنے والے بدر کے کنوئیں پر آئے، ان میں ایک حبشی غلام بھی تھا ۔ زبیر اور اُن کے ساتھیوں نے اس غلام کو پکڑ لیا اور اُس کے ساتھ کے آدمی اپنے لشکر کی طرف بھاگ گئے، یہ لوگ اُسے لیے ہوئے اُس جگہ آئے جہاں رسول نے شب کو قیام فرمایا تھا اور اُس غلام سے ابوسفیان اور اُس کے ساتھیوں کو پوچھنے لگے اس یقین پر کہ یہ اُسی قافلہ میں ہوگا مگر وہ غلام اُنھیں قریش کی فوج اور اُن کے سرداروں کا حال سُنانے لگا ۔ باوجودیکہ وہ بالکل صحیح کیفیت بیان کر رہا تھا، چونکہ وہ ان لوگوں کے جذبات اور تصورات کے بالکل خلاف تھی، وہ تو اس وقت صرف ابوسفیان اور اُس کے ساتھ والے اموال کی دُھن میں تھے اور رسول خدا رکوع و سجود میں مصروف تھے مگر اس حالت میں جو کچھ غلام کے ساتھ ہو رہا تھا

اُسے دیکھ اور سُن رہے تھے تو صورت یہ تھی کہ جب وہ قریش کا ذکر کرتا تھا کہ وہ آرہے ہیں اور اُن کی فوج کی یہ کیفیت ہے. تو یہ لوگ اُسے مارنے لگتے تھے اور اُسے جھٹلاتے تھے اور کہتے تھے کہ تو ہم سے ابوسفیان اور اُس کے ساتھیوں کی کیفیت چھپاتا ہے، جب یہ اُسے بہت مارتے تھے تو وہ مجبور ہو کر کہہ دیتا تھا کہ ہاں صاحب۔ ابوسفیان ہی کا قافلہ آرہا ہے، تب یہ اُسے چھوڑ دیتے تھے، یہی صورت دیر تک ہوتی رہی یہاں تک کہ رسولؐ نے نماز ختم کی اور آپ نے فرمایا! قسم خدا کی جب وہ سچ کہتا ہے تو تم اُسے مارتے ہو اور جب جھوٹ کہتا ہے تو اُسے چھوڑ دیتے ہو۔ ان لوگوں نے کہا وہ تو کہتا ہے کہ قریش کی فوج آئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ٹھیک کہتا ہے، وہ اپنے قافلہ کو بچانے کے لیے آئے ہیں۔ اب آپ نے خود اُس غلام کو بلایا اور اُس سے دریافت فرمایا تو اُس نے قریش کا حال بیان کیا اور کہا مجھے ابوسفیان کے متعلق کچھ علم نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں کی تعداد کتنی ہے؟ اُس نے کہا مجھے پورے طور پر معلوم نہیں۔ بہرحال وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں۔"

رسولؐ کی اس گفتگو سے پہلے جہاں تک ابوسفیان کے قافلہ پر حملہ کی نیت سے اور صرف اسی نیت سے مسلمانوں کا بلکہ پیغمبر خدا کا بھی نکلنا بیان ہوا ہے، راوی نے ہر جز بڑے علم و یقین کے انداز میں پیش کیا ہے، لیکن جہاں سے رسول خدا کے متعلق اس

طرح کے واقعات کا ذکر ہے جو ذرا بھی معمولی درجہ ہی تک سہی آپ کی معاملہ فہمی اور حقیقت بینی پر دلالت کرتے ہیں اُسے یہ "مسلمان" مؤرخ زعموا کی لفظ سے بیان کرنے لگتا ہے، یاد رکھنا چاہیے کہ زعم کی لفظ زیادہ تر گمان باطل یا خوش عقیدگی کے ساتھ جو خیال قائم کر لیا جائے اور جس کا کوئی ثبوت نہ ہو اُس کے لیے آتی ہے چنانچہ یہ آخری جُزو جو ہم نے درج کیا کہ رسولؐ نے یوں فرمایا کہ جب وہ سچ کہتا ہے تو تم اُسے مارتے ہو اور جب جھوٹ کہتا ہے تو اُسے چھوڑ دیتے ہو، اسے اس راوی نے زعموا کی لفظ سے بیان کیا ہے، یعنی مسلمانوں کی خوش عقیدگی یہ ہے کہ وہ رسولؐ کے بارے میں اس طرح کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد دوبارہ "فزعموا" تو ان لوگوں کا خیال ہے" کہہ کر وہ بیان کرتا ہے کہ:۔

"حضرتؐ نے اُن کی تعداد کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے پوچھا کہ یہ سب اُنھیں کھانا کس نے کھلایا تھا؟ اُس نے ایک نام لیا، آپ نے فرمایا کتنے اونٹ اُس میں نحر کر ڈالے تھے؟ اُس نے کہا نو۔ آپ نے فرمایا کل کس نے دعوت کی تھی؟ اُس نے پھر ایک نام لیا۔ آپ نے فرمایا کہ اُس نے کتنے اونٹ نحر کر ڈالے تھے؟ اُس نے کہا دس۔

اموی خلیفہ کے مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم رکھنے والا مؤرخ پھر "فزعموا" کہنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ:۔

"مسلمان ایسا خیال کرتے ہیں کہ یہ سُن کر رسولؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ

نو سو اور ایک ہزار کے بیچ میں ہیں، چنانچہ واقعہ یہی ثابت ہوا کہ وہ نو سو پچاس کی تعداد میں تھے۔ اس کے بعد پیغمبر روانہ ہوئے اور پانی کے کنارے جا کر اُتر پڑے اور اپنے لشکر گاہ میں چھوٹے چھوٹے حوض بنا کر اُن میں پانی بھر لیا اور اپنے اصحاب کی صف بندی کی، یہاں تک کہ وہ فوج آئی تو انھوں نے دیکھا کہ رسول پانی پر پہلے سے قیام کیے ہوئے ہیں ۔"

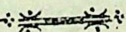
اتنے جزو کے بیان کرنے میں راوی کو "زعموا" کہنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ اس میں تو رسول کی ایک عملی پیش دستی اور اموی نقطۂ نظر سے قریش کی ایک طرح کی مظلومی ظاہر ہوتی ہے، لیکن اب جس جزو سے پیغمبر رسول کی حقیت ثابت ہو وہاں پھر وہ اس احتیاطی ضمیمہ کو لگانا ضروری سمجھتا ہے اور کہتا ہے :-

"فزعموا یعنی مسلمانوں کا خیال ہے کہ رسول نے بارگاہ الٰہی میں ہاتھ اُٹھا دیے کہ یہ قریش اپنی پوری طاقت سے تیرے مقابلہ کے لیے آئے ہیں۔ خداوندا جو تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اُس کا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ۔"

اب بھلا جو مؤرخ رسول کی فضیلت یا حقانیت کو وثوق واطمینان کے ساتھ بیان کرنا نہ چاہتا ہو وہ حضرت علی بن ابی طالب کے کسی کارنامہ، بلکہ ان کے سوا دوسرے کچھ مسلمان سپاہیوں کی بھی جانبازی اور بہادری کا بیان کس طرح پسند کر سکتا ہے، یا محل کے تقاضے سے

کیونکر اس کی ہمت کر سکتا ہے، چنانچہ یہاں تک تو اُس نے اتنی تفصیل سے حال بیان کیا اور اس کے بعد یہ کہہ کر دہ روداد جنگ ختم کیے دیتا ہے کہ "رسولؐ نے اُن کی طرف ایک مٹھی خاک پھینک دی اور اللہ نے انھیں شکست دے دی" اللہ اللہ خیر سلا۔

اب کیا اس کے سمجھنے، سمجھانے میں کوئی دقت باقی رہ گئی کہ مسلمانوں میں جنگ بدر کے پس منظر میں اس طرح کے روایات کیوں آ گئے، جو پوری ذمہ داری سلسلۂ جنگ کے آغاز کی رسولؐ پر ڈال دیں، اور یاد رکھیے کہ یہ وہ اہم نقطہ ہے جس پر پیغمبر اسلامؐ کی پوری زندگی کے واقعات جہاد، بلکہ بنیادی طور پر اسلام کے نظریۂ جہاد کے تعین کا انحصار ہے۔ خود مسلمانوں کی عملی زندگی کے لیے بھی اس کی اہمیت ہے کہ ایک مسلمان کے لیے تیمور، یا نادر، ایسا فاتح ہونا چاہیے، اور اس ضمن میں وہ چنگیز اور ہلاکو کا کردار بھی سامنے لے آئے، تو باعث فخر ہو سکتا ہے، یا اکثر موقعوں پر سکوت اور چشم پوشی اور صبر و مظلومیت بھی کوئی اہمیت رکھتی ہے مسلمانوں نے اس کو نہ سمجھ کر اسلام کے دامن پر ہمیشہ کے لیے دھبا لگوا دیا کہ وہ تلوار سے پھیلایا گیا ہے، اس کی بہت بڑی ذمہ داری بنی اُمیہ کے اوپر ہے۔



سلاطین بنی اُمیّہ کی مزید خاطرداری

اس بنیادی کارروائی کے علاوہ جس سے پوری نوعیت ہی جہاد اسلامی کی بدل جاتی ہے، محدثین اور مورخین کو جنگ بدر کی روداد کے بیان میں بھی سلاطین بنی امیہ کے جذبات کا قدم قدم پر لحاظ کرنا پڑا ہے، چنانچہ باوجودیکہ جنگ بدر میں مشرکین کی طرف سے میدان میں آنے والے، اور اپنے شرک و باطل پر سب سے پہلے جان قربان کرنے والے، بنی امیہ ہی کے تین ممتاز افراد تھے، جن کا سرگروہ معاویہ بن ابی سفیان کا نانا عتبہ بن ربیعہ تھا، پھر بھی مورخین نے امکانی حد تک بنی امیہ کے جرم کو جنگ بدر میں ہلکا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ طبری کے کئی صفحے اسی قسم کے روایات سے پُر ہیں کہ عتبہ بن ربیعہ نے بڑی کوشش جنگ بدر کے ٹالنے اور خونریزی کو روکنے کے لیے کی تھی، مگر ابوجہل ایسا جنگ پر تلا ہوا تھا کہ وہ کسی طرح نہ مانا اور یہ اُس کی شرارت تھی کہ جنگ ہو کر رہی۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو طبری جلد ۲ صفحہ ۲۶۹ و صفحہ ۲۷۰ و صفحہ ۲۷۸ وغیرہ۔

نیز ابوسفیان کی طرف سے بھی ممکن صفائی یہ پیش کی ہے کہ وہ جب صحیح سلامت مکہ پہونچ گیا، تو اُس نے پیغام بھیجا کہ میں خیریت سے پہونچ گیا۔ اب تم لوگ واپس آجاؤ مگر ان لوگوں نے شیخی سے کام لیتے ہوئے کہا، کہ ہم لوگ اب یوں واپس نہ ہوں گے جب تک بدر میں

جاکر تین۳ دن تک ٹھہر نہ لیں، اور ہماری طاقت کو مدینہ والے دیکھ نہ لیں۔ پھر وہ ہمارے مقابلہ کی جراٗت نہ کریں گے۔[1]

بایں ہمہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں ابوسفیان کے ساتھ کسی حد تک اس جنگ آزما لشکر کی بھی صفائی کی کوشش ہے، کہ اُن کا بھی ارادہ اب جنگ کرنے کا نہ تھا، بلکہ وہ فقط اپنی طاقت کی نمائش سے دھمکانا چاہتے تھے، مگر وہ تو رسولؐ اور مسلمان خود جاکر اُن سے بھڑ گئے، اور اُنھیں مجبوراً جنگ کرنا پڑی، یہ ہے اموی خلفاء کے زیر اثر تاریخ کا رجحان!

صحابہ کا امتحان اور مقداد کی مجاہدانہ تقریر جب پیغمبر خداؐ کو قریش کی فوج کے روانہ ہونے کی اطلاع ملی، تو اُن کی فوج کی کثرت اور مسلمانوں کی مادی حیثیت سے بے سروسامانی کے پیش نظر آپ نے صحابہ کو جمع فرما کر اُن کے عزائم کا جائزہ لینا چاہا اور ایک تقریر فرما کر صورت حال کی نزاکت کو پیش فرماتے ہوئے اُن کے خیالات دریافت کیے، اس موقع پر پہلی روایت جو ابن اسحاق کی طرف نسبت دے کر تاریخ پیش کرتی ہے، اُس میں یہ الفاظ ہیں:-

فقام ابوبکر فقال فأحسن ثم قام عمر ابن الخطاب فقال فأحسن	تو ابوبکر کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے کچھ کہا اور خوب کہا پھر عمر بن الخطاب کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے کہا تو بہت اچھا کہا

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۶۹

ثم قام المقداد بن عمرو
فقال یا رسول اللہ امض
لما امرك اللہ فنحن معك
واللہ لا نقول کما قالت
بنو اسرائیل لموسیٰ
اذھب انت و ربك
فقاتلا انا ھھنا قاعدون
ولکن اذھب انت وربك
فقاتلا انا معکما
مقاتلون فوالذی
بعثك بالحق لو سرت
بنا الی برك الغماد یعنی حبش کے دارالحکومت تک
مدینۃ الحبشۃ لجالدنا
معك من دونہ حتی
تبلغہ فقال لہ رسول اللہ
خیرا و دعا لہ بخیر۔[1]

پھر مقداد بن عمرو کھڑے ہوئے اور
اُنھوں نے کہا اے رسول خداؐ چلیے
وہیں جہاں اللہ نے آپ کو حکم
دیا ہے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں، خدا کی قسم
ہم اُس طرح نہیں کہیں گے جیسے بنی اسرائیل
نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم جاؤ اور تمھارا
پروردگار اور تم دونوں جنگ کرلو، ہم
یہیں بیٹھے ہوئے ہیں، بلکہ ہمارا قول یہ
ہے کہ آپ چلیے اور آپ کا پروردگار
اور دونوں جنگ کیجیے اور ہم بھی آپ کے
ساتھ ساتھ جنگ کریں گے۔ قسم اس کی
جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا
کہ اگر آپ ملک حبش کے مرکزی شہر کی
طرف ہمیں لے جانا چاہیں تو ہم آپ کی معیت
میں جنگ کے لیے تیار ہیں یہاں تک کہ آپ کا
مقصد حاصل ہو۔ یہ سُن کر رسولؐ نے اُن کو

اب ذرا ہمت کرکے اس روایت کے انداز پر غور تو کیجیے۔ راوی نے پہلی دو تقریریں مُبہم طور پر بیان کر دیں، مضمون نہیں درج کیا کہ

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۳

ان دونوں مقرروں نے کیا کہا تھا؟ "خیال خاطر احباب" یا ذاتی عقیدت کا تقاضا یا کعت لسان والا اصول، کسی بنا پر اُس نے اِن تقریروں کے خلاف کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے مجملاً کہہ دیا کہ ان دونوں حضرات نے بہت عمدہ باتیں کہیں، یا بہت اچھی تقریر کی، لیکن اس راوی نے پیغمبر کی طرف سے ایک حرف بھی ان تقریروں پر ارشاد فرمانے کا ذکر نہیں کیا۔ اسی سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں تقریریں پیغمبر کی مرضی کے مطابق نہیں تھیں، یا دل شکن عنوان رکھتی تھیں۔ اس کے بعد جب مقداد نے یہ مجاہدانہ تقریر کی تو پیغمبر خوش ہو گئے اور آپ نے انھیں دعائے خیر دی۔ اس سے حقیقت بہت حد تک سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن طبری کی دوسری روایت نے تو بالکل پردہ فاش کر دیا ہے۔ اس میں جناب عبداللہ بن مسعود مشہور صحابیِ رسولؐ کی زبانی یہ درج ہے:۔

لقد شهدت من المقداد مشهداً لان اكون انا صاحبه احب الیّ مما فی الارض من شئ كان رجلاً فارساً وكان رسول اللهؐ اذا غضب احمارّت وجنتاه فاتاه المقداد

میں نے مقداد کا ایک ایسا موقف دیکھا ہے کہ وہ موقف میرے لیے حاصل ہوتا تو میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پسندیدہ ہوتا۔ یہ شہسوار شخص تھے اور رسول خدا جب غضبناک ہوتے تھے تو حضرتؐ کے دونوں رخسارے سرخ ہو جاتے تھے۔ اس حالت میں مقداد آپ کی

علی تلک الحال فقال ابشر یا رسول اللہ فواللہ لا نقول لک کما قالت بنو اسرائیل لموسیٰ اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون ولکن والذی بعثک بالحق لنکونن من بین یدیک ومن خلفک وعن یمینک وعن شمالک او یفتح اللہ لک[۱]۔

خدمت میں آگئے اور کہا مژدہ ہو آپ کو اے رسول خدا، بخدا ہم آپ سے اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح بنی اسرائیل نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم جاؤ اور تمہارا پروردگار، ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔ بلکہ قسم اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ ہم آپ کے آگے رہیں گے، آپ کے پیچھے رہیں گے اور آپ کے دائیں بائیں رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ آپ کو فتح عطا کرے۔

اب ملائیے دونوں روایتوں کو۔ بعض رواۃ نے یہ بتا دیا کہ مقداد کے پہلے کن کی تقریریں ہوئی تھیں، اور اس روایت نے یہ بتا دیا کہ جب مقداد تقریر کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو اس وقت پیغمبر کے غصہ کا کیا عالم تھا۔ اب صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان تقریروں کی نوعیت کیا تھی، اور رسول خداؐ پر ان کا کیا اثر ہوا تھا۔

مقداد کا یہ فقرہ کہ "امض لما امرک اللہ" (یعنی) "روانہ ہو جیے اس کے لیے جو اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے" اس سے صاف

---

[۱] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۴

ظاہر ہے کہ کوئی مجلس شوریٰ نہ تھی، جس سے پیغمبرؐ کو اپنے لیے راہ عمل معین کرنا ہو، آپ کو تو حکم الٰہی روانگی کے لیے پہونچ ہی چکا تھا۔ اب جو جمع فرمایا تھا تو یہ اسی مقصد سے کہ اصحاب کے عزائم سامنے آجائیں، اور دلوں کی باتیں زبانوں سے سن لی جائیں، اور اس کا نتیجہ بھی تاریخ میں ہمارے سامنے آگیا۔

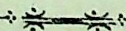
انصار سے خطاب اہل مدینہ کے نمائندوں نے جب مکۂ معظمہ کے مقام عقبہ میں حضرتؐ سے بیعت کی تھی، تو اس وقت یہ کہا تھا کہ ہم اُس وقت تک آپ کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہیں، جب تک آپ ہمارے گھر میں پہونچ نہ جائیں، ہاں جب آپ ہم میں آجائیے گا تو ہم آپ کی اسی طرح حفاظت کریں گے، جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ عہد و پیمان کی اس قید سے ایک یہ پہلو پیدا ہو سکتا تھا کہ جب آپ مدینہ کے اندر ہوں اور کوئی مدینہ میں آپ پر حملہ کرے تو ہم آپ کی حفاظت کریں گے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ حضرتؐ مدینہ سے نکل کر دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے، تو ایک قانونی گنجائش یہ نکلتی تھی کہ اس موقع پر انصار نصرت سے پہلوتہی کریں۔ اس لیے حضرتؐ نے خصوصیت کے ساتھ انصار سے تخاطب فرمایا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ اس پر سعد بن معاذ نے پوچھا کہ کیا خصوصیت کے ساتھ حضورؐ ہم (اہل مدینہ) سے ہی دریافت فرما رہے ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا،

ہاں۔ اس پر اُنھوں نے حسب ذیل تقریر کی :۔

"حضورؐ کے سوال کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی، اور اس کی گواہی دی کہ جو آپ لائے ہیں وہ حق ہے، اور پھر ہم نے آپ کی اطاعت کا عہد کیا، لہذا ہم سے دریافت کرنا کیا ہے؟ جس مہم پر آپ جانا چاہتے ہیں تشریف لے چلیں۔ قسم اُس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ اگر ہمیں لے کر آپ سمندر کی طرف جائیے اور اُس میں پھاند پڑیے، تو ہم اُس میں آپ کے ساتھ ہوں گے۔ ہم میں کا ایک شخص بھی پیچھے نہیں ہٹے گا اور ہمیں اس میں کوئی ناگواری نہیں کہ آپ مستقبل قریب میں ہمارے ساتھ ہمارے دشمن سے مڈبھیڑ کریں ہم جنگ کے موقع پر ثابت قدم، اور میدان کارزار میں سچے ثابت ہوں گے۔ اللہ سے اُمید ہے کہ وہ آپ کی نظر کے سامنے ہمارا کردار ایسا لائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔

لہذا اللہ کا نام لے کر چلیے۔ ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔"

سعد کی اس تقریر سے حضرت بہت خوش ہوئے اور آپ نے فرمایا کہ اچھا اللہ کا نام لے کر چلو اور میں تمھیں فتح و ظفر کی بشارت دیتا ہوں[1]۔



---

[1] طبری جلد ۲ صـ۲۶۲

حالات جنگ

دن اور تاریخ متعدد مؤرخین کی تصریح ہے کہ معرکۂ بدر روز جمعہ ۱۷ ماہ رمضان کو ہوا[1]۔ علامہ سید محسن امین نے کہا ہے ۱۷ یا ۱۹ تاریخ ہجرت نبوی سے انیس مہینہ بعد[2]۔

تعداد فوج مسلمان اس جنگ میں تین سو سے کچھ زیادہ تھے۔ اب یہ کچھ "کتنے تھے؟ اس میں جیسا کہ طبری نے لکھا ہے تھوڑا اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں نے معیناً بتایا ہے کہ تین سو تیرہ ۳۱۳ تھے اور یہی عام طور پر تعداد مشہور ہے جس کی تفصیل ابن عباس کی زبانی وارد ہوئی ہے ستتر مہاجرین تھے اور دو سو چھتیس ۲۳۶ انصار۔ دوسرا قول تین سو اٹھارہ ۳۱۸ اور تیسرا تین سو سات ۳۰۷ کا ہے۔ لیکن زیادہ راویوں نے تین سو کے ساتھ بضعۃ عشر کی لفظ کہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سو دس سے دو چار عدد زیادہ تھے[3]۔

ان کے مقابلہ میں مشرکین کی جو تعداد تھی اس کا تذکرہ عروہ ابن زبیر والی روایت میں آچکا ہے کہ وہ ایک ہزار کے قریب تھے روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی کوشش کی گئی تھی کہ کوئی قابل جنگ آدمی یا ممتاز شخص جس کا دوسروں پر اثر پڑے مکے

---

[1] ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۵۳   [2] اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۲۔

[3] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۲ و صفحہ ۲۷۳۔

اندر رہ نہ جائے۔ ابو سفیان نے اپنی مفسدہ پردازی سے اہل مکہ کو جنگ پر آمادہ کرنے کی جو ترکیب کی تھی وہ اس انداز سے تھی کہ مکہ میں کسی آدمی کو قرار آ ہی نہ سکتا تھا، چنانچہ تاریخ لکھتی ہے کہ اس کا فرستادہ ضمضم بن عمرو غفاری جب مکہ کے قریب پہونچا تو اُس نے دہشت انگیزی کے لیے اپنے اونٹ کی نکیل کاٹ دی، پالان شتر الٹ دیا، اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، اور وہیں سے چیخنا شروع کر دیا کہ اے قریش والو تمھارے تمام اموال جو ابو سفیان کے ساتھ ہیں، اُن پر محمد اور اُن کے اصحاب نے حملہ کر دیا ہے، جلدی خبر لو! الغوث الغوث یعنی فریاد ہے فریاد، اس حالت کو دیکھ کر اور آواز کو سُن کر تمام لوگ بدحواس ہو گئے، اور بے تحاشا چلنے پر آمادہ ہو گئے[1]، اور ہر آدمی کا فریضہ ہو گیا کہ یا وہ خود جائے اور اگر خود جانے کے قابل نہ ہو، تو کسی اور کو اپنی طرف سے بھیجے۔ اس طرح اشراف قریش میں سے کوئی مکہ میں باقی نہیں رہا۔ ایک بہت ہی کبیر السن جسے بڑھاپے کی وجہ سے چلنے میں بھی تکلف ہوتا تھا امیہ بن خلف، اس نے ارادہ کیا تھا کہ مکہ میں رہ جائے تو عقبہ بن ابی معیط اُس کے پاس آیا ایسی حالت میں جب وہ اپنی قوم کے درمیان مسجد میں بیٹھا ہوا تھا اور آگ سے سُلگتی ہوئی انگیٹھی اُس کے سامنے رکھ دی، اور کہا تم تو بس عورتوں کی طرح تاپتے رہو، جس سے متاثر ہو کر وہ بھی چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ انتہا یہ ہے کہ خود

---

[1] طبری جلد ۲ صـ ۲۷۲

پیغمبرؐ کے خاندان کے لوگ یعنی بنی ہاشم کے افراد جو کچھ مجبوریوں سے مکہ میں رہ گئے تھے، انھیں بھی ان لوگوں نے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کیا، چنانچہ رسول خداؐ کے چچا عباس اور حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے بھائی عقیل، ان کے علاوہ نوفل بن حارث بن عبدالمطلب بھی اس فوج میں شامل کیے گئے جو جنگ بدر میں مشرکین کی شکست پر مسلمانوں کے ہاتھ میں بحیثیت قیدی کے گرفتار بھی ہوئے۔ بنی ہاشم میں سے صرف ابولہب خود نہیں آیا بلکہ اپنی جگہ عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیج دیا۔[۱]

کہا جاتا ہے کہ جناب ابوطالب کے سب سے بڑے فرزند طالب کو بھی زبردستی اپنے ساتھ لے گئے تھے مگر وہ عین معرکۂ جنگ سے اس طرح غائب ہوئے کہ نہ اسیروں میں پائے گئے نہ مقتولین میں اور نہ اپنے گھر پر مکہ واپس ہوئے نہ کبھی ان کا کوئی پتہ چلا۔[۲]

عالم شکر

حضرت علیؑ کی عمر دس سال کی تھی جب پیغمبر خداؐ نے اعلان رسالت فرمایا، اس کے بعد تیرہ برس جو مکہ میں گزرے وہ تمام زحمتوں اور مشقتوں میں بسر ہوئے جب کہ رسولؐ جنگ پر مامور نہ تھے اس لیے ایسا کوئی موقع پیش نہیں آیا جب حضرت علی بن ابی طالبؑ تیغ آزمائی کرتے، مگر یہ رسولؐ کی نگاہ انتخاب تھی جو علی بن ابی طالبؑ کی صلاحیتوں کو بغیر کسی آزمائش کے

۱؎ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۱ ۲؎ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۶

خوب دیکھ رہی تھی کہ اس پہلی اسلامی کی لڑائی میں جناب حمزہ ایسے مرد میدان کی موجودگی میں آپ نے مہاجرین کا عَلم علی بن ابی طالبؑ کے سپرد کیا، اور انصار کا علم بردار سعد بن عبادہ کو بنایا۔[1]

ابتدائی شہید آغاز جنگ تیروں سے ہوا جو مشرکین نے روانہ کیے، چنانچہ ان میں پہلا تیر مہجع مولی عمر بن الخطاب کو لگا، اور وہ کام آ گئے، پھر بنی عدی بن نجار میں سے حارثہ بن سراقہ حوض پر پانی پی رہے تھے، ایک تیر اُن پر پڑا جس سے وہ جاں بحق تسلیم ہوئے۔[2]

دست بدست مقابلہ کہاں تو اموی مؤرخین یہ دکھلا رہے تھے کہ عتبہ بن ربیعہ بڑا صلح پسند آدمی تھا، اور کہاں جب جنگ چھڑی تو مشرکین میں سے مقابلہ کے لیے سب سے پہلے ہی عتبہ، اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کے ساتھ نکلا۔ کہا جاتا ہے کہ ابوجہل نے اُس پر بزدلی کا الزام لگایا جس پر اُسے جوش آ گیا، اور اب یہ مؤرخین اُس کی اہمیت دکھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ اُس نے اپنے کو ایک دم اسلحۂ جنگ سے آراستہ کرنا شروع کیا تو لوہے کا خود تلاش کیا، مگر اُس کا سر اتنا بڑا تھا کہ پورے لشکر میں

---

[1] تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۳ [2] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۱

ایسا خود نہ ملا جو اُس کے سر پر آسکے، مجبوراً اُس نے اپنی چادر کو سر پر باندھ لیا۔ ابھی وہ میدان میں نکلنے نہیں پایا تھا کہ ایک شخص مشرکین میں سے جو بہت ہی بدمزاج اور بداخلاق تھا، اسود بن عبدالاسد مخزومی، اُس نے قسم کھائی کہ میں جا کر پانی کے اس حوض سے جو مسلمانوں نے بنایا ہے پانی پیوں گا، اور اُسے گرا دوں گا، چنانچہ وہ اُس حوض کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر سے جناب حمزہ بن عبدالمطلب نے اُسے دیکھ لیا، اور انھوں نے بڑھ کر اُس کے پیر پر تلوار لگائی جس سے اُس کی پنڈلی کٹ گئی اور وہ گر گیا، مگر اپنی جہالت سے باز نہ آیا، اور زمین پر گھسٹ گھسٹ کر اسی حال میں حوض تک پہونچ کر وہ اُس میں گر گیا تاکہ اپنی قسم پوری کر لے، جناب حمزہ نے اُسی حوض میں اُسے قتل کیا۔ اتنی دیر میں عتبہ تیار ہو چکا تھا، چنانچہ سب سے پہلے میدان جنگ میں وہی تینوں آدمی مبارزطلبی کے لیے نکلے یعنی عتبہ بن ربیعہ، اُس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اور تیسرے اُس کا بیٹا ولید بن عتبہ۔

ادھر سے انصار کے چند نوجوان نکلے۔ عتبہ نے کہا ہمیں تم سے مقابلہ نہیں کرنا ہے، ہمارے سامنے ہمارے خاندان والے عبدالمطلب کی نسل کے لوگ کیوں نہیں آتے۔ پیغمبر خداؐ کی نظر انتخاب اب حمزہ اور عبیدہ کے ساتھ جو معمر ہونے کی بنا پر مختلف جنگوں میں قبل اسلام بھی ممکن ہے کارہائے نمایاں کیے

ہوئے ہوں، علی بن ابی طالب پر پڑی، اور وہی جو علم دار بنایا گیا تھا ایک سپاہی کی حیثیت سے پکارا گیا، تاریخ کے الفاظ یہ ہیں کہ رسولؐ نے آواز دی :-

یا علی قم یا حمزۃ قم	اے علیؑ تم اٹھو، اے حمزہ آپ اٹھیے
یا عبیدۃ بن الحارث قم[1]	اے عبیدہ بن حارث آپ اٹھیے۔

یہ عبیدہ بھی رسولؐ کے چچازاد بھائی تھے مگر کافی کبیر السن تھے جبکہ جناب حمزہ رسولؐ کے چچا ہونے کے ساتھ آپ کے ہم عمر تھے اور ان دونوں کے مقابلہ میں علیؑ گویا بچہ کی حیثیت رکھتے تھے یعنی اس وقت صرف چوبیس برس کا تھا۔

عبیدہ جو سب سے زیادہ عمر رکھتے تھے عتبہ کے مقابل میں نبرد آزما ہوئے اور حمزہ شیبہ کے مقابلہ میں اور علیؑ ولید کے سامنے آئے جو ادھر والوں میں عمر کے لحاظ سے جوان تھا چنانچہ جناب حمزہ اور حضرت علیؑ نے بلا توقف اپنے اپنے حریفوں کا خاتمہ کیا مگر عبیدہ اور عتبہ میں یہ ہوا کہ دونوں نے اپنے مدمقابل کو گھائل کر دیا اور عبیدہ کے چونکہ پیر پر تلوار پڑی اس لیے وہ گر گئے مگر یہاں حمزہ اور علیؑ دونوں اپنے مدمقابل کی جنگ سے فراغت پا چکے تھے اس لیے عتبہ زندہ پلٹ نہ سکا اور وہ ان کی تلواروں سے ختم ہو گیا[2]۔ دونوں

---

[1] تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۰ [2] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۹

بزرگوار عبیدہ کو اٹھا کر رسول خداؐ کی خدمت میں لے گئے۔ عبیدہ کو جیسے اس وقت اپنے زندہ رہ جانے کا افسوس تھا، چنانچہ رسولؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ کیا میں شہیدوں میں محسوب نہ ہوسکوں گا؟ حضرتؐ نے فرمایا کیوں نہیں، یعنی آپ ضرور اجر شہادت کے مستحق ہیں[۱]۔ بعد میں عبیدہ اس زخم سے جانبر نہیں ہوسکے اور تھوڑے ہی دن کے بعد جاں بحق تسلیم ہوئے۔

فرشتوں کی امداد یہ امر مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کے لیے ناقابل انکار ہے کہ اس جنگ میں صفوف ملائکہ بھی بحکم الٰہی امداد کے لیے حاضر تھے جس کا تذکرہ صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں ہے۔ تاریخ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے اس طرح کہ جب جنگ ختم ہوئی تو قیدیوں میں عباس بن عبدالمطلب بھی تھے جنھیں اسیر کر کے انصار کا ایک شخص رسولؐ کے پاس لایا۔ عباس نے کہا حقیقت میں اس نے مجھے گرفتار نہیں کیا تھا۔ وہ تو ایک نہایت خوبصورت شخص ایک ابلق گھوڑے پر تھا جو اب نظر نہیں آتا، انصاری نے کہا واللہ میں نے گرفتار کیا ہے۔ رسولؐ نے فرمایا دونوں باتیں سچ ہیں، تم نے گرفتاری کی کوشش کی اور خدا نے تمھاری مدد اپنے ایک فرشتہ کے ذریعہ سے کی[۲]۔

جناب ابن عباس کی روایت ہے کہ قبیلہ غفار کے ایک شخص نے

---

[۱] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۹

[۲] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۷

جو بعد میں اسلام لے آیا تھا بیان کیا کہ جنگ بدر میں میں اپنے ایک چچا زاد بھائی کے ساتھ جب کہ ہم دونوں ابھی دائرۂ شرک میں تھے ایک پہاڑ پر چڑھ کر اس انتظار میں ٹھہرا کہ مسلمانوں کو شکست ہو تو مال غنیمت لوٹنے میں ہم بھی شریک ہو جائیں، تو ہم نے ایک دفعہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنی اور کسی کی صدا جو اپنے گھوڑے کو للکار رہا تھا کہ بڑھ حیزوم بڑھ، میرے ساتھی پر تو ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ اسی وقت ختم ہو گیا اور میں بھی بس قریب مرگ ہو گیا تھا پھر سنبھل گیا۔

اس کے ساتھ ایک مسلمان مجاہد ابو داؤد مازنی کا بیان ہے کہ میں مشرکین میں سے ایک شخص کا پیچھا کر رہا تھا کہ اسے قتل کروں کہ ایک دفعہ اُس کا سر کٹ کے زمین پر آ رہا حالانکہ میری تلوار اُس سے دور تھی۔ میں سمجھا کہ اُسے کسی اور نے قتل کر دیا جو آنکھوں کے سامنے نہ تھا[1]۔

ایک اور واقعہ جس کے راوی ابو رافع ہیں جو پہلے عباس بن عبدالمطلب کے غلام تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ہمارے گھر میں اسلام داخل ہو چکا تھا مگر عباس مصلحۃً اس کا اظہار نہ کرتے تھے۔ ہم سب لوگ بھی عالم تقیہ میں تھے۔ جنگ بدر جو ختم ہوئی تو ابو سفیان بن حارث بن عبدالمطلب واپس ہوئے، ابو لہب نے اُن سے

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۳

جنگ کی روداد پوچھنا شروع کی۔ وہ بیٹھ کے بیان کرنے لگے اور بہت سے لوگ کھڑے ہو کر اس کو سننے لگے۔ انھوں نے فوج مشرکین کی شکست کا حال بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں تو اُن پر کسی بزدلی کا الزام نہ لگاؤں گا۔ ہمارا مقابلہ تو کچھ نئی طرح کے گورے رنگ کے اشخاص سے ہوا تھا جو آسمان و زمین کے درمیان چل رہے تھے ابلق گھوڑوں پر سوار اُن کا مقابلہ کوئی کر ہی نہیں سکتا تھا۔ (ابو رافع کا بیان ہے) یہ سُننا تھا کہ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا کہ وہ فرشتے تھے۔ یہ سنتے ہی ابولہب نے ہاتھ اٹھایا اور میرے منھ پر زور سے تھپڑ مار دیا[1]۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فرشتے اس طرح تھے کہ مسلمان سپاہی اُن کو نہیں دیکھ رہے تھے لیکن فریق مخالف کی فوج کے اکثر افراد انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ گویا مسلمانوں کے لیے یہ بھی ایمان بالغیب کا ایک امتحان ہی تھا۔

رسول اللہؐ کی شجاعت } یہ اسلام کی سب سے پہلی لڑائی تھی، اس لیے عام مسلمانوں پر بڑا ہراس تھا۔ اس موقع پر حضرت پیغمبر خداؐ کی طمانیت و استقلال اور شجاعت و ہمت کا اظہار مسلمانوں کے سب سے بڑے شجاع حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے اس طرح کیا ہے کہ جب بدر کا موقع

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۱۸۶

تھا اور مقابلہ اُن پر آ تو تمام تر رسول اللہؐ کی پناہ میں تھی اور آپ کی جرأت و ہمت سب سے زیادہ نمایاں تھی اور آپ ہم سب میں زیادہ دشمن سے قریب تھے[1]۔ اس سے ظاہر ہے کہ پیغمبر خداؐ مسلمانوں سے الگ کسی جائے پناہ (مثلاً عریش وغیرہ) میں نہ تھے اور کوئی صاحب آپ کے محافظ بن کر کھڑے نہیں ہوئے تھے۔

یہ استقلال اور استحکام رسولؐ کا تو خلق کے سامنے تھا اور حق کی بارگاہ میں جو تذلل اور عاجزی کی کیفیت تھی وہ بھی حضرت علیؑ کی دوسری روایت سے ظاہر ہوتی ہے، آپ نے فرمایا جنگ بدر والی رات کو ہم میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ سویا مگر رسول خداؐ ایک درخت کے نیچے رات بھر کھڑے نمازیں پڑھتے رہے اور دعائیں مانگتے رہے[2]۔

کچھ شہدائے اسلام { جناب عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب نیز آغاز جنگ کے سلسلہ میں جن دو مجاہدوں کی تیروں سے شہادت ہوئی، ان کے علاوہ اس جنگ میں جو مسلمان شہید ہوئے اُن میں سے دو کا بڑا دلچسپ تذکرہ تاریخ میں ملتا ہے۔

(۱) عمیر بن حمام جو بنی سلمہ میں سے تھے۔ رسولؐ نے ترغیب

---

[1] تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷ [2] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷

جہاد کے لیے تقریر فرمائی اور ارشاد کیا :-

والذی نفس محمد بیدہ قسم ہے اُس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی لایقاتلھم الیوم رجل جان ہے کہ اُن سے آج جو بھی شخص جنگ فیقتل صابرا محتسبا مقبلا کرے گا اور قتل ہو جائے گا صبر و ضبط کے غیر مدبر الا ادخلہ اللہ ساتھ رضائے الٰہی کے پیش نظر اس طرح کہ الجنۃ ۔ آگے بڑھتا رہے، پیٹھ نہ پھیرائے تو اُسے

عمیر بن حمام اس وقت رطب کھا رہے تھے، یہ الفاظ سُننا تھے کہ انھوں نے رطب ہاتھ سے پھینک دیے اور کہا جنت تک پہونچنے میں اتنی ہی دیر تو ہے کہ یہ لوگ مجھے قتل کر دیں۔ بس یہ کہا اور فوج دشمن پر حملہ کر دیا یہاں تک کہ قتل ہوئے ۔

(۲) عوف بن حارث بن عفرا ۔ انھوں نے رسول اللہؐ کے پاس آکر کہا، بندہ کا کیا عمل ہو سکتا ہے جو اپنے پروردگار کو ہنسا دے ؟ آپ نے فرمایا یہ کہ وہ جہاد کے وقت دشمن کے سامنے زرہ بھی جسم سے الگ کر دے ۔ یہ سُننا تھا کہ اُنھوں نے زرہ جسم سے اُتار کر پھینک دی اور تلوار لے کر جنگ کرنے لگے یہاں تک کہ قتل ہوئے[۱] ۔



---

[۱] طبری جلد ۲ صہ ۲۸۱

نتیجہ جنگ

مشرکین کی شکست اور اُن کے مقتولین کی کثرت اور اہمیت

اسے غیبی امداد نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے کہ جنگ بدر میں باوجودیکہ مسلمانوں کی طرف انتہائی بے سروسامانی تھی اور تعداد بھی ان کی بہت کم تھی، پھر بھی اس جنگ کے نتیجہ میں جو نمایاں کامیابی مسلمانوں کو ہوئی ویسی پھر کبھی نظر نہیں آتی، اُن لڑائیوں میں کہ جو بعد میں ہوئیں جن میں مسلمانوں کی تعداد بھی نسبتہً زیادہ ہو گئی تھی، اُن کے دل بھی بڑھ چکے تھے اور ساز و سامان بھی جنگ کا کافی فراہم ہو چکا تھا۔ اس لیے کہ اس جنگ میں مشرکین کو اس معنی میں شکست نہیں ہوئی کہ وہ ناکام ہو کر واپس چلے گئے ہوں اور اُن کی فوج منتشر ہو گئی ہو بلکہ اس کے علاوہ یہ ہوا کہ جتنے اُن کے سربرآوردہ افراد اور رؤسائے لشکر تھے سب ہی تقریباً اس معرکہ میں قتل ہو گئے جیسے عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ جن کے قتل کا ذکر پہلے آ چکا ہے، ان کے علاوہ سب سے بڑا اُن کا سرغنہ ابوجہل بن ہشام اور اُس کے ساتھ زمعہ بن اسود اور ابوالبختری بن ہشام اور امیہ بن خلف اور نبیہ اور منبہ فرزندان حجاج وغیرہ یہ سب ہی اشخاص اس جنگ میں کام آئے چنانچہ

ان میں سے بعض کی مختصر کیفیت درج کی جاتی ہے۔

ابو البختری} اس شخص کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ حضرت
پیغمبر خدا کے مکہ معظمہ میں قیام کے دور میں جب
آپ پر مظالم کی شدت تھی تو لوگوں کو آپ کی ایذا رسانی سے
بہت حد تک روکتا تھا، اور شعب ابی طالب کے محاصرہ کے
وقت بنی ہاشم سے ترک تعلقات کا جو معاہدہ لکھا گیا تھا۔ اس
معاہدہ کو منسوخ کرانے میں بھی یہ پیش پیش تھا اس لیے حضرت
پیغمبر خدا نے بدر میں تمام مسلمانوں کو ہدایت فرما دی تھی کہ یہ
ملے تو اسے قتل نہ کیا جائے مگر بدر میں جب یہ آیا ہے تو ایک
عزیز اس کا اس کے ناقہ پر ہم سفر تھا۔ یہ ملیحہ دختر زہیر بن حارث
بن اسد کا لڑکا جنادہ تھا اور ابو البختری کا نام مع نسب عاص
ابن ہشام بن حارث بن اسد تھا، اس طرح جنادہ اس کا بھانجا
ہوتا تھا، میدان جنگ میں جماعت انصار کے ایک شخص مجذر
بن زیاد بلوی سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو مجذر نے کہا کہ تم
اپنی جان بچا کر نکل جاؤ اس لیے کہ رسول خدا نے تمہارے
قتل کرنے سے منع کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اور میرا ساتھی جو ناقہ
پر میرے ساتھ آیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہم تنہا تمھاری
حفاظت کے ذمہ دار ہیں، اس نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ میں بھی
اس کے ساتھ جان دوں گا، ورنہ قریش کی عورتیں مکہ میں چرچا

کرینگی کہ میں نے زندہ رہنے کے لالچ میں اپنے ساتھی کو چھوڑ دیا اور یہ کہہ کر مجذر سے جنگ کرنے لگا۔ وہ رجز میں یہ شعر پڑھ رہا تھا:۔

لن یسلم ابن حرۃ أ لمیلہ
حتی یموت أو یری سبیلہ

مطلب یہ ہے کہ کوئی شریف آدمی اپنے ساتھی کو نہیں چھوڑا کرتا جب تک خود بھی اُس کے ساتھ مر نہ جائے۔

بالآخر جنگ ہوئی اور مجذر بن زیاد نے اُسے قتل کر ڈالا اور پیغمبر خدا صلعم کے پاس آ کے عذر خواہی کے انداز میں روداد بیان کی کہ میں نے بڑی کوشش کی کہ میں اُسے قتل نہ کروں اور زندہ ہی آپ کے پاس لے آؤں مگر اُس نے جنگ کے سوا کوئی صورت قبول نہ کی، مجبوراً میں نے جنگ کی اور قتل کر دیا۔[1]

ہمارے نزدیک اب دارا نیارا تو اُس کا ہو ہی چکا تھا اس لیے شاید رسالتماب صلعم نے یہ سن کر سکوت فرمایا ہو ورنہ جو روداد تاریخ نے پیش کی ہے اُس کے لحاظ سے اگر مجذر خود اُسے اپنا فیصلہ نہ سُنا دیتے اور کہتے کہ چلو رسول صلعم کے پاس اور اپنے عزیز کے لیے بھی کہو، ممکن ہے پیغمبر خدا اسے بھی معاف کر دیں تو شاید وہ اس پر تیار ہو جاتا اور ممکن ہے کہ پھر رسول خدا صلعم اُس کے سابق کردار کے پاس ولحاظ سے جو آپ کے پیشِ نظر تھا اُس کے عزیز کے

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۲

بارے میں بھی اُس کی مطلب براری فرما دیتے۔

امیہ بن خلف } یہ شخص اکابر قریش میں سے تھا اور اسلام کے خلاف بڑا متشدد، یہی شخص تھا جو مکہ میں بلال پر انتہائی ستم ڈھاتا تھا کہ وہ اسلام کو چھوڑ دیں چنانچہ وہ انھیں مکہ کے ریگستان کی طرف لے جاتا تھا اور دوپہر کی دھوپ میں اُن کے جسم کو برہنہ کر کے انھیں ریگ پر لٹاتا تھا اور پھر ایک بڑا پتھر منگوا کر اُن کے سینے پر رکھتا تھا اور کہتا تھا کہ محمدؐ کے دین کو چھوڑ دو لیکن وہ اَحَد اَحَد یعنی خدا ایک ہے کے نعرے لگاتے رہتے تھے۔ ہاں اس شخص کی جناب عبدالرحمٰن بن عوف کے ساتھ جو روایات جمہور کے مطابق بڑے درجہ کے صحابی اور عشرہ مبشرہ کی ایک فرد ہیں، بڑی دوستی تھی خود ابن عوف کا بیان ہے کہ میرا پہلا نام عبدعمرو تھا جب میں مسلمان ہوا تو میرا نام عبدالرحمٰن قرار دیا گیا مگر میری دوستی امیہ بن خلف کے ساتھ قائم رہی۔ وہ جب مجھے ملتا تھا تو عبدعمرو کہہ کر پکارتا تھا اور کہتا تھا کہ اس نام کو چھوڑ دو گے جو تمہارے باپ نے تمہارا رکھا تھا؟ میں کہہ دیتا کہ ہاں وہ نام اب میں نہیں چاہتا۔ وہ کہتا تھا کہ میں "الرحمٰن" کو نہیں پہچانتا، لہٰذا کوئی درمیانی نام بتاؤ جس سے میں تمھیں پکاروں، اس لیے کہ میں عبدعمرو کہوں گا تو تم جواب نہ دو گے اور میں عبدالرحمٰن کہہ کر پکارنے سے رہا۔

میں نے کہا تم ہی کوئی درمیانی نام تجویز کرو، اس نے کہا عبداللہ، میں نے کہا ہاں ٹھیک ہے، چنانچہ جب وہ میری طرف سے گزرتا تھا تو مجھے عبدالالٰہ کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور میں جواب دیتا تھا، گفتگو ہوا کرتی تھی۔ جنگ بدر کے موقع پر میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے علی بن امیہ کا ہاتھ پکڑے کھڑا ہے اور میرے ہاتھ میں کچھ زرہیں تھیں جن پر میں نے مال غنیمت کے طور پر مقتولین کے جسم سے اتار کر قبضہ کیا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی پکارا یا عبدعمرو! میں نے جواب نہیں دیا تو اُس نے کہا یا عبدالالٰہ! میں بولا کہو کیا کہتے ہو؟ اُس نے کہا کیا تم مجھے اپنے ساتھ لیتے ہو؟ میں تمہارے لیے ان زرہوں سے بہتر ہوں جو تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ میں نے کہا ہاں ٹھیک ہے اور میں نے زرہیں اپنے ہاتھ سے پھینک دیں اور ایک ہاتھ سے اُس کا اور ایک ہاتھ سے اُس کے بیٹے علی کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں کو اپنے ساتھ لے چلا۔ اب تقریباً ان دونوں کو اطمینان ہو گیا تھا کہ جان بچ گئی، چنانچہ راستے میں اُس نے پوچھا کہ اے عبدالالٰہ بتاؤ وہ شخص کون تھا جس کے سینہ پر شتر مرغ کے پر کا نشان لگا ہے؟ میں نے کہا وہ حمزہ بن عبدالمطلب ہیں۔ عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لیے جا رہا تھا کہ ایک دفعہ بلال کی اُس پر نظر پڑ گئی اور انھیں وہ مظالم یاد آ گئے جو یہ شخص اُن پر کرتا تھا اور پکار کے کہا کہ ارے یہ تو راس الکفر

امیہ بن خلف ہے، یہ زندہ نہیں جا سکتا۔ میں نے کہا یہ دونوں میرے قیدی ہیں۔ بلال نے کہا ہوا کرے، میں زندہ ہوں تو یہ زندہ نہیں رہ سکتا اور یہ کہہ کر مسلمانوں کو للکارا کہ اے انصار خدا یہ راس الکفر امیہ بن خلف ہے، زندہ نہ جانے پائے۔ بس مسلمانوں کی جماعت نے ہمارا حلقہ کر لیا اور حملہ کر دیا اور میں ان دونوں کو بچا رہا تھا۔ اتنی دیر میں ایک شخص نے اُس کے بیٹے پر تلوار لگائی اور وہ گر گیا اور امیہ نے ایسی چیخ ماری جیسی میں نے کبھی نہیں سُنی تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے دونوں کا کام تمام کر دیا۔

عبد الرحمٰن بن عوف کو ہمیشہ افسوس رہا اور کہتے تھے کہ بلال کی بدولت میری زرہیں بھی گئیں اور دونوں قیدی بھی بچ نہ سکے[1]

ابو جہل } تمام فوج کا سرغنہ ابو جہل بن ہشام تھا مگر اُس کے متعلق کوئی صاف بات معلوم نہیں ہو رہی تھی کہ اُس کا کیا حشر ہوا؟ چنانچہ پیغمبر خدا[2] نے حکم دیا کہ اُسے مقتولین کی لاشوں میں ڈھونڈھا جائے۔ حضرت[3] نے فرمایا اگر تمھیں صورت سے پہچاننے میں دشواری ہو تو ایک پہچان اُس کی میں بتلائے دیتا ہوں کہ اُس کے گھٹنے میں ایک زخم کا نشان ہے

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۳

جس کا واقعہ یہ ہے کہ بچپن میں اُس نے مجھ سے ایک مرتبہ جھگڑا کیا اور میں نے اُسے دھکا دیا تو وہ گھٹنے کے بھل زمین پر گر گیا جس سے اُس کے گھٹنے پر ایسا زخم آیا کہ مندمل ہونے کے بعد بھی اُس کا نشان ہمیشہ باقی رہا۔ اُس نے پھر مکہ میں دعوت اسلام کی مخالفت بھی نہایت شدت کے ساتھ کی تھی اسلیے تمام مسلمانوں کو اُس کی فکر تھی۔ آخر عبداللہ بن مسعودؓ نے لاشوں کے اندر اُسے پا لیا۔

انصار میں سے ایک جوان معاذ بن عمرو بن جموح نے بعد میں یہ کیفیت بتائی کہ سب سے پہلے ابو جہل سے میری مڈبھیڑ ہوئی اور میں نے مشرکین کو سُنا کہ وہ پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ دیکھو ابوالحکم تک کوئی پہونچنے نہ پائے۔ یہ ابوجہل کی کنیت تھی جو مشرکین کے یہاں تھی، ابوجہل تو اُسے مسلمانوں نے کہنا شروع کیا تھا جو اب تاریخ اسلام میں اُس کا نام ہو گیا ہے۔ معاذ کا بیان ہے کہ جب میں نے یہ سُنا تو میں نے اُسی کو اپنا نصب العین بنا لیا چنانچہ جوں ہی موقع ملا میں نے اُس پر حملہ کیا تو ضرب اُس کی پنڈلی پر پڑی جس سے وہ زمین پر گر پڑا مگر اُس کے بیٹے عکرمہ نے میرے شانہ پر تلوار لگائی اور میرا ہاتھ اس طرح کٹ گیا کہ بس کھال رہ گئی اور ہاتھ اس کھال میں لٹکنے لگا۔ اب میں ایک ہاتھ سے جنگ کرنے لگا مگر وہ لٹکتا ہوا ہاتھ میرے لیے باعث زحمت تھا تو میں نے اپنے پیر کے نیچے ہاتھ کو رکھ کر اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ وہ جُدا ہو گیا اور میں نے اُسے پھینک دیا۔

مورخین کا بیان ہے کہ معاذ اس کے بعد خلیفہ سوم کے

دور تک زندہ رہے۔

اب ابوجہل زخمی تو ہو چکا تھا مگر یہ زخم اُس کے لیے باعث ہلاکت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد ادھر سے ایک دوسرے انصاری معوذ بن عفراء کا گزر ہوا تو انھوں نے اُس پر ضرب لگائی جس سے وہ نیم جاں ہو گیا، پھر بھی اُس میں رمقے جان باقی تھی۔ اور معوذ دوسرے لوگوں سے جنگ میں شہید ہو گئے۔ ابوجہل لاشوں کے ساتھ زخمی حالت میں پڑا رہ گیا یہاں تک کہ ابن مسعود تلاش کرتے ہوئے اُس تک پہونچے۔ خود ابن مسعود ایک دفعہ مکہ میں اُس کی لاتیں کھا چکے تھے اور اُس کے ہاتھ سے بڑی اذیت اُٹھا چکے تھے اب آخر میں انھوں نے اُس کی زندگی کا خاتمہ کیا اور اُس کا سر جسم سے جُدا کر کے پیغمبر خداؐ کے پاس لائے جس پر حضرت نے شکر خدا ادا کیا۔[1]

نضر بن حارث بن کلدہ } اس کا باپ عرب کا مشہور طبیب تھا اور یہ خود باعث مشرکین میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا، یہ زندہ گرفتار ہوا تھا پھر اسے رسولؐ کے حکم سے حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے قتل کیا۔

عقبہ بن ابی معیط } یہ بھی زندہ گرفتار ہوا تھا، پیغمبر خداؐ نے اس کے بھی قتل کا حکم دیا، چنانچہ

---

[1] طبری جلد ۲ صہ ۲۸۴

جماعت انصار میں سے عاصم بن ثابت نے اُس کا کام تمام کیا۔

جنگ کے بعد

مال غنیمت پر اختلاف یہ فتح مبین جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی، اس پر مسلمان جتنا بھی شکر الٰہی ادا کرتے کم تھا۔ اس فتح کو بلا کسی تاویل و تکلف کے صرف تائید الٰہی کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے جس میں دلاوران اسلام کے عملی کارنامہ کی منزل پر تاریخ صرف تین ہی شخصیتوں کا پتہ دیتی ہے جو تینوں اولاد عبد المطلب یعنی رسولؐ کے قریبی گھرانے کے افراد ہیں: ایک حمزہ، دوسرے عبیدہ جو درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور تیسرے علی بن ابی طالبؑ۔ ان کے علاوہ اور کسی مسلمان کا کوئی بڑا کارنامہ اس معرکہ میں سامنے نہیں آیا مگر جب جنگ سر ہوئی تو مال غنیمت پر حق جمانے کے لیے مسلمانوں میں جھگڑا ہونے لگا۔ جن لوگوں نے ان اموال غنیمت کو لوٹا تھا اُن میں سے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ اُس کا لوٹا ہوا مال خود اُس کا قرار پا جائے۔ وہ لوگ جو مورچے پر تھے کہہ رہے تھے کہ ہم اگر دشمن سے مقابلہ نہ کرتے تو تمھیں اس کا لوٹنا نصیب ہی کہاں ہوتا۔ اس لیے ہمارا بھی اس میں حصہ ہونا چاہیے، کچھ لوگ جو حفاظت کی

سلہ طبری جلد ۲ صہ ۲۸۶

خاطر یا خود پناہ لیے ہوئے رسول خداؐ کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے انھوں نے کہا کہ ہم تو حفاظت رسولؐ کی وجہ سے جنگ میں شریک نہ ہو سکے لہذا ہمارا حصہ بھی سب کے برابر ہے۔ یہ نزاع اتنی اہمیت اختیار کر گئی کہ ایک مستقل سورہ قرآن کا "الانفال" اس کے تصفیہ کے لیے اُترا اور خالق کی طرف سے یہ فیصلہ ہوا کہ یہ تمام اموال پیغمبرؐ سے تعلق رکھتے ہیں، چنانچہ آپ نے ان کو تمام مسلمانوں میں برابر سے تقسیم فرما دیا[1]۔

ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ جب اس خاص الخاص جماعت صحابہ میں جو "بدریین" کے معزز نام سے حدیث اور تاریخ میں امتیاز رکھتی ہے مال غنیمت کے سلسلہ میں یہ ذہنیت کارفرما ہے تو آئندہ چل کر جب فتوحات میں وسعت ہو گی اور اموال غنیمت کی بدرجہا زیادہ فراوانی ہو گی اور مسلمانوں میں بھی عوام کی کثرت ہو جائے گی تو اُس وقت نفسی نفسی کا کیا عالم ہو گا، اور جب اس تھوڑے سے مال غنیمت کے لیے یہ عالم ہے تو جب مسند اقتدار اور گویا تاج و تخت کا سوال پیدا ہو گا تو اُس وقت للہیت، خلوص اور صاحبانِ حقوق کے حقوق کا لحاظ کہاں قائم رہ سکتا ہے۔

رؤسائے قریش کے مقتول اور اسیر ہونے کی خبر پہلے مکہ میں تشہیر کی اُن اِکّا دُکّا آدمیوں سے جو فراریوں کی حیثیت سے

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۵ و ۲۸۶۔

وہاں پہونچے سنی گئی تو لوگوں نے انھیں جھٹلایا، چنانچہ اُن میں سے ایک شخص نے سب ان مقتولین کے نام گنوانا شروع کیے جو بڑے بڑے آدمی تھے تو صفوان بن امیہ نے جو حجر اسمٰعیل میں بیٹھا ہوا تھا ایک آدمی سے کہا کہ ذرا اس سے میرے متعلق دریافت کرو مطلب یہ تھا کہ سب غلط سلط کہہ رہا ہے تو مجھے بھی مقتولین میں شمار کر دے گا، چنانچہ کسی نے کہا کہ صفوان بن امیہ کا کیا ہوا؟ اُس نے کہا وہ تو سامنے حجر اسمٰعیل میں بیٹھے ہوئے ہیں مگر میں نے ان کے باپ (امیہ بن خلف) اور بھائی کو اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔[1]

جیسا کہ اس روایت کا ابتدائی حصہ پہلے آچکا ہے ابو رافع نے جو عبدالمطلب کے غلام تھے اور اپنے مالک اور اُن کے گھر والوں کی طرح عالم تقیہ میں مکہ کے اندر زندگی گزار رہے تھے بیان کیا ہے کہ جب ابولہب جنگ کے حالات کسی سے پوچھ رہا تھا تو اس شخص نے کہا کہ شکست نہ کھاتے تو کیا کرتے! ہمارے مقابلہ میں تو کچھ نئی طرح کے نورانی چہروں کے سپاہی آئے جن کے سامنے کوئی ٹھہرتا ہی نہیں تھا۔ ابو رافع کہتے ہیں کہ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ وہ فرشتے تھے۔ بس یہ سننا تھا کہ ابولہب نے مجھے طمانچہ مارا اور زمین پر مجھے گرا کر میرے سینہ پر چڑھ بیٹھا۔

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۷۔

یہ دیکھ کر میری مالکہ اُمّ الفضل زوجہ عباس لکڑی کا ایک ستون لیے ہوئے جھپٹیں، اُنھوں نے ابولہب کے سر پر اُسے مارا اور کہا کہ اُس کا مالک نہیں موجود ہے تو تم نے اُسے کمزور سمجھ لیا ہے۔ ابولہب زخمی ہو کر ذلت کی حالت میں وہاں سے چلا گیا۔[1]

ابولہب کی ہلاکت

ابولہب خود جنگ احد میں نہیں گیا تھا اس نے اپنی طرف سے ایک دوسرے شخص عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیج دیا تھا مگر خالق کو اب اور روسائے قریش کی طرح اس کی بھی زندگی کا خاتمہ کرنا تھا چنانچہ جنگ بدر کے چند دن کے بعد بڑی خراب قسم کی چیچک میں مبتلا ہوا اور ہلاک ہو گیا۔ چونکہ اس مرض کو شدید طور پر متعدی سمجھا جاتا تھا، اُس کے لڑکوں تک نے اُس کے قریب جانے سے پرہیز کیا۔ یہاں تک کہ اُس کی لاش سے بدبو اطراف میں پھیلنے لگی تو لوگوں نے اُس کے لڑکوں کو بُرا بھلا کہا اور آخر سب مل کر آئے اور بغیر غسل و کفن کے اُسے اُٹھا کر مکہ کے باہر ایک جگہ لے جا کر ڈال دیا اور دُور سے اُس پر پتھر برسائے اتنے کہ اُس کا جسم دب گیا۔[2]

مشرکین کی ذہنیت اور گریہ کی ممانعت

کہا جاتا ہے کہ شروع میں قریش کے گھروں میں مقتولین پر نوحہ و ماتم ہوا

---

[1] طبری جلد ۲ ص ۲۸۷ - ۲۸۸

[2] طبری جلد ۲ ص ۸۸

مگر پھر انھوں نے کہا کہ ایسا نہ کرو، محمدؐ اور اُن کے اصحاب کو یہ خبر پہونچے گی تو وہ شماتت کریں گے چنانچہ سب نے ایک دم گریہ و ماتم چھوڑ دیا۔ ان میں اسود بن عبدیغوث ایک شخص تھا جس کے تین بیٹے زمعہ بن اسود، عقیل بن اسود اور حارث بن اسود قتل ہوئے تھے۔ وہ اپنے بیٹوں پر رونے کے لیے بہت بے تاب مگر قوم کے دباؤ سے مجبور تھا۔ ایک رات کو اُس نے کسی رونے والی کی آواز سُنی تو اپنے غلام سے کہا کہ دیکھو اگر قریش اپنے مقتولوں پر رو رہے ہوں، تو میں اپنے فرزند زمعہ پر رونا شروع کر دوں، اس لیے کہ میرا کلیجہ پھُنا جاتا ہے۔ غلام نے واپس آکر بتایا کہ ایک عورت کا اونٹ کھو گیا ہے وہ اُس پر رو رہی ہے۔ یہ سُن کر اسود نے اسی کو بہانہ بنا کر کچھ شعر مقتولین بدر کے مرثیہ میں کہہ دیے جن کا خلاصہ یہ تھا کہ ارے تو ایک اونٹ کے کھونے پر روتی ہے اور ایسے ایسے آدمی جو بدر میں قتل ہو گئے اُن پر گریہ نہیں کرتی[۱]۔

اسیروں کا فدیہ کچھ اسیر ایسے تھے جو قتل سے بچ گئے اور اُن کو فدیہ یعنی مالی معاوضہ لے کر چھوڑ دیا گیا، چنانچہ خلفائے بنی عباس کے مورث اعلےٰ، عباس بن عبدالمطلب انھی میں سے تھے حالانکہ انھوں نے فدیہ سے بچنے کے لیے بڑی کوشش کی اور کہا یا رسول اللہ میں تو حقیقت میں مسلمان تھا

---

[۱] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۹

یہ لوگ مجھے اپنے ساتھ زبردستی لائے تھے۔ حضرتؐ نے فرمایا وہ آپ کا اسلام جو دل میں تھا اُسے تو اللہ جانے اور وہ اُس کی جزا دینا ہے تو دے گا مگر ظاہر میں تو آپ اُس جماعت میں شامل تھے اور ہمارے مقابلہ پر آئے تھے، اس لیے بغیر فدیہ کے آپ چھوڑے نہیں جا سکتے، اور چونکہ مجھے آپ کی مالی حالت معلوم ہے اس لیے دوسرے عزیز بھی آپ کے جو اس جنگ میں آئے ہیں اُن کا بھی فدیہ آپ ہی ادا کیجیے بلکہ ایک اپنے حلیف (یعنی قسم) عتبہ بن عمرو کا بھی۔ انھوں نے بڑی ردّ و بدل کی مگر کوئی نتیجہ نہ ہوا اور آخر انھوں نے اپنے اموال سے یہ سب فدیے ادا کر کے رہائی حاصل کی۔

اسیروں میں ابو سفیان کا ایک بیٹا عمرو بھی تھا اور اس کا دوسرا بھائی حنظلہ اسی بدر میں قتل ہو چکا تھا۔ لوگوں نے ابو سفیان سے کہا کہ اب عمرو کو فدیہ دے کر بچا لو مگر اُس نے جواب دیا کہ کیا جانی نقصان کے ساتھ مالی نقصان بھی برداشت کروں؟! رہنے دو، جب تک اُن کا دل چاہے رکھیں، مگر یہ عجیب اتفاق ہوا کہ ایک ضعیف العمر مسلمان سعد بن نعمان جو قبیلۂ بنی عمرو بن عوف میں سے تھے بالکل بے خیالی سے عمرہ کے قصد سے مکہ گئے تھے۔ اب تک عملدرآمد یہ تھا کہ حج یا عمرہ کے لیے آنے والوں سے تعرض نہ کیا جاتا تھا مگر ابو سفیان کو جو یہ پتہ لگا تو

اُس نے ان بچارے کو قید کر لیا اور کہا بس یہ شخص عمرو بن ابی سفیان کے عوض میں یہاں رہے گا۔ اب ان کے قبیلہ والے حضرت رسول خداؐ کے پاس گئے، واقعہ بیان کیا اور خواہش کی کہ عمرو بن ابی سفیان کو ہمارے ساتھ کر دیجیے تاکہ ہم اپنے اُس بزرگ کو چھڑا لائیں۔ آپ نے اُن کی درخواست کو قبول فرمایا۔ اس طرح عمرو کی رہائی ہو گئی۔[1]

اسیروں میں وہ سہیل بن عمرو بھی تھا جس کا نام بعد میں حدیبیہ کی صلح کے ذیل میں مشہور و معروف ہے یہ بھی فدیہ لے کر رہا کیا گیا، چونکہ سہیل بن عمرو مشرکین میں بہت اچھا خطیب تھا اس لیے اسے چھوڑتے وقت حضرت عمر نے یہ نادر منصوبہ سوچا کہ رسولؐ سے عرض کیا مجھے اتنی اجازت دیجیے کہ میں سہیل بن عمرو کے نیچے والے دو دانت اکھاڑ لوں۔ پھر یہ آپ کے خلاف کبھی کوئی تقریر نہیں کر سکے گا۔ رسولؐ نے فرمایا مثلہ کرنا یعنی کسی حصۂ جسم کو جدا کرنا جائز نہیں ہے۔ حضرت کی لفظیں اس موقع کی راوی نے یہ بیان کی ہیں کہ:۔

لا امثل به فيمثل الله بي وان كنت نبيا	میں نبی ہوتے ہوئے بھی اگر اس کا کوئی جزو قطع کر دوں تو اللہ میرے بھی اعضا کو قطع کرے گا۔

[1] طبری جلد ۲ صفحہ

اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ ممکن ہے کبھی اس کی قوت تقریر حق کی حمایت میں صرف ہو چنانچہ سہیل بن عمرو کو صحیح و سالم رہا کر دیا گیا[۱]۔

تعداد مقتولین مسلمانوں کی بے سر و سامانی کے باوجود ان کا جانی نقصان بہت کم ہوا۔ یعنی صرف چودہ اشخاص قتل ہوئے۔ چھ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے[۲] مگر مشرکین میں سے ستر آدمی قتل ہوئے اور ستر اسیر ہوئے[۳]۔ ستر میں پینتیس حضرت علی بن ابی طالبؑ کے تنہا قتل کیے ہوئے تھے اور باقی نصف دوسرے مجاہدین کے ہاتھ سے مارے گئے تھے[۴]۔

اسی بنا پر مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ :-

"غزوۂ بدر کے ہیرو (اسد اللہ الغالب) علی بن ابی طالب ہیں"[۵]

آپ کے ہاتھ سے قتل ہونے والے کچھ خاص خاص افراد کے نام یہ ہیں :-

(۱) ولید بن عتبہ بن ربیعہ (۲) عاص بن سعید بن عاص بن امیّہ۔ (۳) طعیمہ بن عدی بن نوفل (۴) نوفل بن خویلد جو جنگ جمل کے

---

[۱] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۹ [۲] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۶
[۳] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۷۰ و اعلام الوریٰ [۴] اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ۱ صفحہ ۸۷-۸۹
[۵] سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۲۵۷

مشہور سردار زبیر کا چچا تھا اور مسلمانوں پر بڑا تشدد کرتا تھا۔ چنانچہ اختتام جنگ کے بعد اس کے متعلق رسولؐ نے خصوصیت سے دریافت فرمایا تو حضرت علی بن ابی طالبؑ نے کہا کہ اُسے میں نے قتل کیا ہے، اس پر رسول خداؐ نے صدائے تکبیر بلند کی۔

(۵) حنظلہ بن ابوسفیان، خود حضرت علیؑ نے اس کی کیفیت بیان فرمائی ہے کہ ولید بن عتبہ کے قتل ہونے پر یہ (اس کا بھانجا) میدان میں آیا۔ میں نے اُس کے سر پر تلوار ماری تو وہ اُس کی آنکھوں تک اُتر آئی اور وہ قتل ہو کر زمین پر گر گیا۔

(۶) زمعہ بن اسود (۷) حارث بن زمعہ

(۸) عمیر بن عثمان بن کعب بن تیم۔ یہ جمل کے دوسرے سردار طلحہ کا چچا تھا۔

جناب حمزہ بن عبدالمطلب نے شیبہ بن ربیعہ بن عبد شمس اور اسود بن عبد الاسود مخزومی کو قتل کیا اور عمرو بن جموح اور پھر آخر میں عبداللہ بن مسعود نے ابوجہل کا خاتمہ کیا اور عمار بن یاسر نے امیہ بن خلف کو۔[۱]

مقتولوں اور اسیروں کے ساتھ سلوک مجسم خلق عظیم جیسے دوستی اور دشمنی سے قطع نظر اور ایمان و کفر کی تفریق سے بھی آگے حقوق انسانی کی تعلیم دینا تھی، اُس نے

---

[۱] اعلام الوری۔

مشرکین اور اپنے دشمنوں کی لاشوں کو بھی میدان جنگ میں اس طرح چھوڑنا کہ چیل کوّے اُنھیں کھائیں پسند نہیں کیا، بلکہ اُن کی لاشوں کو پاس کے کنوئیں میں ڈلوا کر ایک طرح اُنھیں دفن کر دیا، ہاں اُن کے عبرت ناک انجام پر حاضر اور غائب ہر ایک کو متنبہ کرنے کے لیے اور ماضی اور حال دونوں کا موازنہ ظاہر فرمانے کے لیے آپ نے کنوئیں کے کنارے کھڑے ہو کر اُن کے روٴسا کو نام بنام آواز دی:۔ یا عتبۃ بن ربیعۃ یا شیبۃ بن ربیعۃ یا امیۃ بن خلف یا ابا جھل بن ھشام وغیرہ وغیرہ۔

ھل وجدتم ما وعد کم ربکم حقا فانی قد وجدت ما وعدنی ربی حقا۔	کیا تم نے اُسے جو پروردگار نے تمھیں خبر دی تھی (عذاب کا آنا) حق پایا میں نے تو اُسے جو مجھ سے پروردگار کا وعدہ تھا (فتح و نصرت) بالکل حق پایا۔

یہ ندا اُن الفاظ قرآن سے ماخوذ تھی جہاں اہل بہشت اہل دوزخ کو ایسے ہی الفاظ میں اُن کے عبرت ناک انجام کو دکھا رہے ہوں گے۔ سطحی نگاہ والے حاضر الوقت بعض صحابہ نے کہہ دیا یا رسول اللہ! آپ بے جان لاشوں کو آواز دے رہے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ تم میں قوت سماعت اُن سے زیادہ نہیں ہے مگر وہ میری بات کا جواب نہیں دے سکتے۔[1]

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۵

یاد رکھنا چاہیے کہ یہ انتہائی بداعمالی اور سخت ترین کافر افراد تھے جن کے ارواح کا پیغمبرؐ نے بعد موت بھی باخبر ہونا ظاہر فرمایا۔ اس کے بعد کیا تعجب خیز نہیں ہے مسلمانوں میں سے ایسی جماعت کا نظریہ جو خود رسول خدا یا دیگر اولیاء و مقربین کو بھی پکارنے یا اُن سے تخاطب کرنے کو بے کار اور بے معنی سمجھتی ہو۔

مقتولین میں صرف امیہ بن خلف ایسا تھا کہ اُس کی لاش کنوئیں میں پھینکی نہ جا سکی۔ وہ زرہ کے اندر ایسی پھول گئی تھی کہ مسلمانوں نے اُسے زرہ سے نکالنے کی کوشش کی تو اُس کے جسم کے پرخچے اُڑ گئے لہٰذا اُسے وہیں رہنے دیا گیا اور اتنی مٹی اور کنکر پتھر وغیرہ اُس پر ڈال دیے کہ وہ اُن کے نیچے دب جائے۔ ۵۷

قیدیوں کے ساتھ بھی سوا چند کے جو قتل کیے گئے تھے، بہت اچھا سلوک کیا گیا۔ یہ قیدی مختلف صاحب استطاعت مسلمانوں کے سپرد ہوئے جو اُن کے کھانے کے کفیل قرار دیے گئے اور ان مسلمانوں کو ان اسیروں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی جس کا ذکر مصعب بن عمیر کے بھائی ابوعزیز بن عمیر نے جو اسیروں میں تھا اس طرح کیا ہے کہ پیغمبرؐ نے اسیروں کے ساتھ جو اچھے سلوک کی ہدایت فرمائی اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ میں انصار میں سے

---

۵۷ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۵

جس شخص کے سپرد تھا وہ اور اُس کے گھر والے کھجوریں کھا کے بسر کرتے تھے اور روٹی مجھے دے دیتے تھے اور میں خود بعض وقت واپس کرنا چاہتا تھا کہ آپ لوگ کھائیے تو وہ نہیں مانتے تھے اور روٹی واپس نہیں لیتے تھے[1]

مالدار قیدیوں سے فدیہ لے کر رہا کیا گیا جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور جو نادار قیدی تھے اور پڑھے لکھے تھے اُن کے لیے یہ فیصلہ ہوا کہ وہ مدینہ کے دس دس مسلمان لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انھیں رہا کر دیا جائے گا، اور جو اس لائق بھی نہ تھے اُنھیں بغیر فدیہ کے رہا کر دیا گیا[2]

نتائج اور اثرات } یہ اسلام کی سب سے پہلی جنگ تھی اس لیے فطری طور پر اس کے نتائج اور اثرات کو بڑا دور رس ہونا ہی چاہیے۔ قریبی نتائج کو عبدالباری صاحب ایم، اے کی زبان سے سُنیے :-

"مارے جانے والوں میں ان کے قبائل کے بڑے بڑے سردار اور اسلام کی مخالفت پر ابھارنے والے نامور ان تقریباً سب ختم ہو گئے، ان کی موت نے قریش کی کمر توڑ دی اور تحریک اسلامی کی جڑ مضبوط کر دی۔ قرب و جوار کے علاقوں پر مسلمانوں کی دھاک جم گئی اور مدینہ میں

---

[1] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۷   [2] اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صفحہ ۵۳

منافقین اور یہود کو بھی کچھ ڈھیلا کر دیا۔" [1]

یہ تو عام اسلامی نگاہ سے اس کا قریبی نتیجہ تھا۔ اب ذرا اس جنگ کے اثرات پر مقتولین کی اُس فہرست کو سامنے رکھ کر غور کیجیے جو حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے تو آپ کو اس میں زیادہ تعداد بنی امیہ کے افراد کی ملے گی اور خصوصیت کے ساتھ وہ افراد جن سے آل ابوسفیان کا گہرا تعلق ہے جیسے عتبہ بن ربیعہ ـــ یہ کون ہے، ہندہ جگر خوارہ زوجۂ ابوسفیان کا باپ اور امیر شام معاویہ بن ابی سفیان کا نانا اور اس کا بیٹا ولید یعنی ہندہ کا بھائی اور معاویہ کا حقیقی ماموں، پھر حنظلہ بن ابی سفیان ہندہ کا بیٹا اور معاویہ کا حقیقی بھائی ـــ ان کے علاوہ دوسرے بنی امیہ جیسے عاص بن سعید بن عاص بن امیہ وغیرہ۔

یہ داغ عربوں کی انتقام پسند فطرت کی بنا پر بنی امیہ اور بالخصوص نسل ابوسفیان کے دلوں سے مٹنے والے نہ تھے اور پیغمبرؐ کے بعد اگر کوئی سیاسی مصلحت اس کی متقاضی نہ سمجھی جائے کہ بنی ہاشم اور علیؑ و آل علیؑ کے خلاف ان جذبات کی پرورش کی جائے تو پھر اس کو تدبر کے خلاف ایک سیاسی غلطی ماننا پڑے گا کہ اس جماعت کو بہ حیثیت حکمران مسلمانوں میں اقتدار حاصل کرنے کا

---

[1] دعوت دہلی، سیرت طیبہ، ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء ۱۲ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ ص ۱۹۰

موقع دے دیا جاوے جس کے نتیجہ میں اسلام کی تاریخ خود مسلمانوں کے ہاتھوں خون سے رنگین ہو جاوے، اور شام کے دربار میں انہی ابوسفیان اور ہندہ کے پوتے یزید کے اُن اشعار کی گونج سُنائی دے جو اُس نے حسینؓ بن علیؓ اور تقریبًا پورے خاندان رسولؐ کے قتل کیے جانے اور اسیران اہل بیتؑ کے لائے جانے کے موقع پر پڑھے تھے، جس میں اپنے بدر والے بزرگوں کو یاد کیا تھا اور کہا تھا کہ آج وہ ہوتے تو مجھے شاباشی دیتے کہ میں نے کیسا اُن کا بدلا لیا ہے — اس کے ساتھ ذرا ہمت کر کے نوفل بن خویلد عم زبیر اور عمیر بن عثمان عم طلحہ کو بھی دیکھ لیجیے تو اندازہ ہو جاوے گا کہ جمل اور صفین اور کربلا سب اُسی جہاد اسلامی کے مختلف اجزا ہیں جن کی پہلی کڑی جنگ بدر تھی۔

غزوہ بنی قینقاع

جماعت یہود سے جیسا کہ پہلے آچکا ہے یہ معاہدہ ہوا تھا کہ اگر مدینہ پر کوئی حملہ ہو تو انھیں رسولؐ اور مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ اب اگر یہ ساتھ نہ بھی دیتے تو کم از کم ان کو الگ ہی رہنا چاہیے تھا۔

مدینہ میں ان یہودیوں کے کئی قبیلے تھے، ان میں سے ایک بنی قینقاع تھے، ان کے پاس زمین و باغات وغیرہ نہ تھے بلکہ یہ

یہ سُنار لوگ تھے اور صنعت و حرفت سے دولتمند بنے ہوئے تھے۔

جماعت یہود میں سب سے پہلے انھوں نے عہد شکنی کی اور جنگ بدر میں انھوں نے مشرکین کی مدد کی۔ جب پیغمبرؐ بدر کی جنگ سر کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ نے اُن کے کردار پر انھیں سرزنش فرمائی۔ اس کے جواب میں بجائے اس کے کہ وہ اظہار ندامت کرتے اُنھوں نے بڑے سرکشانہ انداز میں کہا کہ ہمیں قریش نہ سمجھ لیجیے گا۔ وہ جن سے آپ کا مقابلہ ہوا تھا فن جنگ سے واقف نہیں تھے ہم سے اگر جنگ ہو تو دیکھیے گا کہ مرد میدان کیسے ہوتے ہیں۔ اب اس کے بعد ظاہر ہے کہ معاہدہ کی پابندی کا کوئی سوال نہ تھا، آپ نے اُن کے خلاف تادیبی کارروائی کا ارادہ فرمایا تو انھوں نے قلعہ کی پناہ لی۔ رسولؐ نے قلعہ کا محاصرہ فرما لیا۔ یہ جنگ بدر کے دوسرے مہینے یعنی شوال سنہ۲ھ کا واقعہ ہے۔ یہ محاصرہ پندرہ(۱۵) دن تک جاری رہا۔ پھر اُنھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور آمادہ ہو گئے کہ رسولؐ جو فیصلہ اُن کے حق میں چاہیں فرمائیں، چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ وہ مدینہ کو چھوڑ کر باہر نکل جائیں اور عبادہ بن صامت اس پر مامور ہوئے کہ وہ اُن کے ساتھ جا کر حدود مدینہ سے باہر پہنچا آئیں چنانچہ وہ نکل کر سرحد شام کی جانب چلے گئے اور اس طرح مدینہ کو اُن کے خطرہ سے نجات ملی[۱]۔

---

[۱] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۷-۲۹۸-

عقد حضرت سیّدۂ عالمؑ

اسی سنہ ہجری کے ماہ ذیقعد میں پیغمبر خداؐ نے اپنی اکلوتی بیٹی خاتون جنت حضرت فاطمہ زہراؑ کا عقد حضرت سیدالاولیا علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ فرمایا جیسا کہ ہم نے "رہنمایان اسلام" میں لکھا ہے :-

"چونکہ شریعت اسلام میں تاکید ہے کہ لڑکی کے بلوغ کے بعد اُس کی شادی میں دیر نہ کی جائے اور ہجرت کے ایک سال بعد حضرت فاطمہ زہراؑ کی عمر نو برس کی ہو گئی جو شرعاً لڑکی کے بالغ ہونے کا سن ہے اس لیے اب وقت آ گیا تھا کہ پیغمبرؐ اس فریضہ سے سبکدوش ہوں۔ روایتیں بتاتی ہیں کہ متعدد صحابہ اس اعزاز کے حصول کی تمنا رکھتے تھے اور اُنھوں نے پیغمبرؐ کی بارگاہ میں آ کر خود خواستگاری کی مگر کسی کا معروضہ قابل قبول قرار نہ پایا۔ فاطمہ زہراؑ کی شادی کے لیے صرف ایک ہی فرد موزوں تھی اور وہ وہی جس کو خدا کے گھر میں پیدا ہونے کا شرف حاصل تھا، پھر اُس نے پیغمبرؐ کی آغوش میں پرورش پائی۔ پھر آغاز رسالت ہی سے پیغمبرؐ کا دست و بازو بنا۔ بچپن ہی میں پیغمبرؐ سے عہد وفاداری کیا اور اب ہجرت میں بستر رسولؐ پر کھنچی ہوئی تلواروں کے حصار میں سو کر اور کھیر برر

میں یہ کارنمایاں انجام دے کر اُس عہد کی عملی تکمیل کردی۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں کی تحریک سے حضرت علی بن ابی طالبؑ نے رسولؐ کی بارگاہ میں آکر بہت محجوبانہ انداز میں یہ تمنا پیش کی اور رسولؐ کی طرف سے اس کی پذیرائی اس طرح ہوی جیسے کہ ان کی خواستگاری کا انتظار ہی تھا ــــ رسولؐ نے دریافت فرمایا کہ تمھارے پاس مال دنیا سے بھی کچھ ہے؟ عرض کیا کہ سوا گھوڑے تلوار اور زرہ کے اور کچھ میرے پاس نہیں ہے، رسولؐ نے فرمایا کہ گھوڑا اور تلوار تمھارے ایسے مجاہد کے لیے ضروری ہے مگر زرہ غیر ضروری چیز ہے اسے فروخت کرڈالو، اس زرہ کی جو قیمت آئی اُس سے حضرت علی بن ابی طالبؑ نے حضرت فاطمہؑ کا زرِ مہر ادا کیا۔ وہ چار سو مثقال چاندی تھا جو تقریباً پانچ سو درہم کی مقدار میں ہوتا تھا اور ہمارے یہاں کے مروجہ اوزان کے مطابق اُس کی مقدار ایک سو تیرہ تولے چاندی ہوتی ہے۔ اس کے بعد رسولؐ نے عقد پڑھ دیا اور اپنے خصوصیات نیز سادگی کے اعتبار سے اسلامی تاریخ میں یہ بے مثالی اور مثالی شادی عمل میں آئی۔"

اس سال کے دوسرے واقعات

تبدیلی قبلہ جیسا کہ ہم نے پارۂ دوم تفسیر قرآن میں لکھا ہے

ابتدائے اسلام میں قبلہ بیت المقدس تھا۔ مدینہ میں آنے کے بعد بھی حضرتؐ کچھ عرصہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ یہ مدت کتنی تھی؟ اس میں اختلاف ہے۔ شیخ الطائفہ کی کتاب تہذیب میں امام جعفر صادقؑ کی زبانی ہے کہ جنگ بدر سے واپسی تک حضرت نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے۔ ایسا ہی رسالہ فضل بن شاذان میں ہے۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ آپ نے مدینہ میں آنے کے بعد سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی ہے۔ براء بن عازب نے سولہ یا سترہ مہینے کہے ہیں قرب الاسناد میں امام محمد باقرؑ کی زبانی انیس مہینے درج ہیں یہی صدوق کی کتاب "من لا یحضر" میں لکھی ہے۔ شیخ مفید نے مسار الشیعہ میں تاریخ کے تعین کے ساتھ بتایا ہے کہ تحویل قبلہ ۱۵ رجب ۲ھ میں ہوئی ہے۔ سیوطی نے در منثور میں اس کی موافقت کی ہے۔ بہرحال اس مدت کے اختلاف سے تبدیلی قبلہ کے اصل واقعہ کے یقینی ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قرآن مجید کے آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پیغمبر خدا کا عمل باوجودیکہ بیت المقدس ہی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا تھا مگر آپ کا دل یہ چاہتا تھا کہ کعبہ قبلہ ہوتا۔ اس لیے کہ جیسا کافی کی حدیث معتبر بتاتی ہے مکہ معظمہ میں آپ کا عمل یہ تھا کہ آپ کعبہ کے سامنے اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ رخ بیت المقدس کی طرف ہو لیکن مدینہ میں

آ کر دونوں کا اجتماع ممکن نہ رہا مگر آپ نے اپنی دلی خواہش کے مطابق عمل نہیں فرمایا اور حکم الٰہی کے انتظار میں بیت المقدس ہی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔

اہل سنت کے صحاح ستہ اور شیعوں کے کتب اربعہ۔ ان سب سے یہ واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ مسجد قبا میں لوگ نماز صبح پڑھ رہے تھے جب ایک شخص نے آ کر اطلاع دی کہ کعبہ کی طرف منھ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آ گیا ہے۔ یہ سُن کر نماز کی حالت ہی میں شام سے مکہ کی طرف منھ پھیر لیا گیا۔ علی بن ابراہیم کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ہے کہ جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم مسجد بنی سالم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ دو رکعتیں بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے ہوئی تھیں کہ تبدیلی قبلہ کا حکم نازل ہوا اور حضرتؐ نے باقی دو رکعتیں کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر پڑھیں۔ ممکن ہے یہ واقعہ عشاء کی نماز کا ہو جس کی خبر مسجد قبا میں صبح کی نماز کے وقت پہونچی۔ اس پر یہود اور منافقین نے کیا کیا نکتہ چینیاں کیں اور اُس پر قرآن نے کس کس طرح جوابات دیے۔ اس کو قرآن اور اُس کے تراجم یا تفاسیر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

صحابی رسولؐ جناب عثمان کی وفات } جناب عثمان بن مظعون قرشی اصحاب رسولؐ میں سے بڑے جلیل المرتبہ تھے اور سابقین الی الاسلام میں وہ چودھویں فرد تھے۔ وہ ہجرت اولیٰ

یعنی ملک حبشہ والے سفر کے بھی مہاجر تھے اور اب مدینہ کی طرف ہجرت بھی کی اور جنگ بدر میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد اسی سنہ ۲ھ کے ماہ ذی الحج میں ان کی وفات ہوئی جس کا پیغمبر خداؐ کو بڑا صدمہ ہوا۔ یہ ان کی رفعت مرتبہ کا ثبوت ہے کہ پیغمبر خداؐ نے اُن کی لاش پر جھک کے بوسہ لیا اور جب سر اُٹھایا تو گریہ کے آثار نمایاں تھے۔ پھر آپ نے نماز پڑھائی اور انھیں جنۃ البقیع میں دفن کیا اور بطور نشان قبر اُن کی قبر کے سرہانے ایک پتھر رکھ دیا اور آپ اکثر اُن کی قبر کی زیارت کو تشریف لے جاتے تھے۔

اس واقعہ میں نجدی ذہنیت والوں کی بصیرت کے لیے متعدد پہلو ہیں جو سُرمہ چشم بن سکتے ہیں۔ لاش کا بوسہ لینا خواہ بہ نظر احترام، خواہ بتقاضائے محبت۔ پھر گریہ فرمانا۔ پھر قبر پر بطور نشان پتھر کا رکھنا جس سے ظاہر ہے کہ جلیل القدر اور مذہبی حیثیت سے بزرگ مرتبہ افراد کے قبور کا نمایاں رہنا خدا و رسولؐ کو پسند ہے۔

اس قبر کو پیغمبرؐ نے ہمیشہ یاد رکھا اور اس کی مرکزیت کو بڑھانے کی طرف توجہ فرمائی، چنانچہ جب آپ کے فرزند جناب ابراہیم کی وفات ہوئی جو اس کے کئی برس بعد کا واقعہ ہے تو آپ نے فرمایا کہ ہم اس کو عثمان بن مظعون کی قبر کے پاس دفن کریں گے۔ یہ واقعہ جوار صالحین میں دفن کی فضیلت کا ثبوت ہے۔

غزوۂ سویق

اس سال کا تقریباً آخری واقعہ غزوۂ سویق ہے جو روز یکشنبہ ۲۳ ذی الحج کو واقع ہوا ہے۔ اس کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے اور وہ یہ ہے کہ امیر شام معاویہ کے والد ابو سفیان کو بدر میں مشرکین کی شکست پر اتنا جوش آیا کہ انھوں نے نذر کر ڈالی کہ وہ (کیسی ہی) نجاست میں مبتلا ہوں) اس وقت تک غسل نہ کریں گے جب تک کہ پیغمبر خدا سے جنگ نہ کر لیں مگر ظاہر ہے کہ بدر کے انجام کو دیکھنے کے بعد رسول سے مقابلہ کی جلدی تیاری نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف یہ نذر مجبور کر رہی تھی کہ شگون کے طور پر سہی جنگ کا نام ضرور ہو جائے۔ ماہ رمضان کے بعد ذی الحج تک تقریباً تین مہینے اسی حالت میں بسر ہوئے۔ اب کہاں تک اس عالم میں رہا جاتا۔ آخر کو ابو سفیان نے اپنی قسم کو پورا کرنے کے لیے دو سو سوار قریش کے اپنے ساتھ لے کر مدینہ کی طرف رُخ کیا۔ اس طرح کہ تاریکی شب میں سفر کرتے اور دن کو چھپ جاتے تھے تاکہ رسول کو پہلے سے خبر نہ ہو جائے۔ سہارا اس کا تھا کہ یہود کی ہمدردیاں ازاوّل ہمارے ساتھ ہیں اور اب تو بنی قینقاع کے جلا وطن کیے جانے سے اُن کے جذبات اور مشتعل ہو چکے ہوں گے۔ ہم ان سے اگر ایسا ساز باز کر لیں گے کہ وہ اندرون مدینہ خلفشار پیدا کر دیں اور ہم باہر سے حملہ آور ہو جائیں تو آسانی سے مسلمانوں کو شکست دی جا سکے گی۔ چنانچہ اُس نے اپنی جماعت کو

بیرونِ مدینہ کسی مخفی مقام پر چھوڑ کے رات کے وقت خود تنہا قبیلہ بنی نضیر میں جا کر اُن کے سردار حیی بن اخطب کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر اُس پر ایسا مسلمانوں کا خوف طاری تھا کہ اُس نے دروازہ بھی نہ کھولا۔ اب یہ ایک اُن کے دوسرے سردار اور محافظ خزانہ سلام بن مشکم کے یہاں پہونچا۔ اس نے کھلانے پلانے میں ظاہری خاطر داری تو خوب کی مگر اصل مقصد کے لیے کوئی ہمت افزا جواب نہ دیا، یہ ناکام و نامراد ہو کر شب کے آخری حصہ میں اپنے ساتھیوں کے پاس واپس گیا مگر خفت مٹانے کو اور اپنے خیال میں اپنی نذر پوری کرنے کے لیے اس نے کچھ اپنے آدمیوں کو مدینہ کے ایک بیرونی حصہ کی طرف بھیج دیا اور اُدھر کے کچھ درخت جلا دیے اور اتفاق سے ایک آدمی انصار میں سے اور اُس کا ایک ساتھی دونوں اپنے کھیت میں کچھ کام کر رہے تھے، ان دونوں کو قتل کر دیا اور اس کے بعد صبح ہونے سے پہلے واپس چلے گئے اور اب ابوسفیان اپنی پوری جماعت کے ساتھ ایسی گھبراہٹ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوا کہ بار ہلکا کرنے کے لیے راستے میں جا بجا ستوؤں کی گٹھریاں جو کھانے کے لیے ساتھ تھیں پھینکتے ہوئے چلے گئے، اور پیغمبر اس اطلاع کے ملنے پر جو تعاقب میں نکلے اور قرقرۃ الکدر تک تشریف لے گئے تو مسلمانوں کو راہ میں جا بجا یہ ستو مال غنیمت میں ملے اسی لیے اس مہم کا نام "غزوۂ سویق" ہو گیا کیونکہ عربی میں ستو کو سَوِیق کہتے ہیں[1]

---

[1] طبری، ج ۲ ص ۲۹۹-۳۰۰

--- (۳ ہجری) ---

چھوٹے غزوات

غزوۂ قرقرۃ الکدر کو جسے "قرارۃ الکدر" بھی کہتے ہیں۔ شیخ عبد الحق نے تو مدارج النبوۃ میں بس اتنا لکھ دیا ہے کہ یہ ایک جگہ کا نام ہے مگر علامہ سید محسن عاملی نے اس کی وجہ تسمیہ لکھی ہے کہ قرقرۃ تو سیدھی ہموار زمین کو کہتے ہیں اور اسی طرح کی ایک زمین تھی جہاں بنی سلیم کا قیام تھا، اور "کدر" طائر ہوتے ہیں مٹیالے رنگ کے، چونکہ اس مقام میں یہ طائر پائے جاتے تھے اس لیے وہ زمین اس نام سے موسوم ہوئی۔

یہ مہم ۱۵ر محرم سنہ ۳ھ یعنی ہجرت کے تیئیسویں مہینے کے شروع میں ہوئی۔ اس کی کیفیت میں شیخ عبد الحق نے بس اتنا لکھا ہے کہ :-

با جمعے از مہاجرین و انصار متوجہ ایشاں شد و لوائے ترتیب داد کہ او را بہ علی مرتضےٰ سپرد۔[1]	مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے ساتھ حضرت ان کی جانب روانہ ہوئے اور ایک علم آراستہ کیا جو علی مرتضےٰ کے سپرد فرمایا۔

طبری نے بھی واقدی کی زبانی لکھا ہے کہ حضرت کا لوا حضرت علی بن ابی طالبؑ کے سپرد تھا۔[2]

بس اس کے آگے اس مہم کا پس منظر ہمیں تاریخ میں نہیں ملتا مگر

---

[1] مدارج النبوۃ　[2] طبری جلد ۲ صفحہ ۲۹۹

اس کے قبل کی مہم غزوۃ السویق کے حالات میں یہ آچکا ہے کہ ابو سفیان کے تعاقب میں حضرتؐ قرقرۃ الکدر تک تشریف لے گئے اور پھر مدینہ کی طرف واپس گئے۔ اس کے بعد دوسرے مہینے اس سرزمین کی طرف آپ کا بصورت جنگ تشریف لے جانا اس کا پتہ دیتا ہے کہ آپ کو پہلی مرتبہ اس طرف جانے میں یہ معلوم ہوا کہ ابو سفیان کے ساتھیوں نے جو اس موقع پر اہل مدینہ میں سے دو کو قتل کیا تھا اور مکانوں میں آگ لگائی تھی اور درختوں کو جلایا تھا اس میں مقامی قبیلہ کے افراد کی شرکت تھی اور اس لیے آپ نے انھیں سزا دینے کی ضرورت محسوس فرمائی۔

غزوۂ ذی امر ذی امر قبیلۂ غطفان کے ایک چشمہ کا نام تھا اور اسی لیے ابن سعد نے طبقات میں غزوۂ غطفان لکھا ہے۔ یہ پہاڑ نجد کی طرف تھا اور اس جگہ اس قبیلہ کا نخلستان تھا۔[1]

واقعہ یہ تھا کہ غزوۂ سویق سے واپس آنے کے بعد حضرتؐ کو خبر ملی کہ قبیلۂ غطفان نے تیاری کی ہے کہ وہ مدینہ پر حملہ کریں گے اور ان کا سردار دعثور بن حارث بن محارب ہے۔ یہ سن کر آپ چار سو پچاس آدمیوں کے ساتھ اس کے مقابلہ کو نکلے مگر ان لوگوں نے راہ فرار اختیار کی اور مختلف پہاڑیوں پر منتشر ہوگئے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ حضرتؐ نے صفر کا پورا مہینہ تقریباً نجد میں گزارا مگر دشمنوں نے مقابلہ کی ہمت نہ کی۔[2]

---

[1] اعیان الشیعہ جلد ۲ ص ۱۷۵
[2] طبری جلد ۳ ص ۲

اس سلسلہ میں حضرؐ کے اعتماد علی اللہ اور جلال حقانیت کا ایک
عجیب منظر سامنے آیا کہ اسی قیام کے زمانہ میں ایک دن بارش ہوئی
اور آپ کے کپڑے پانی سے تر ہو گئے تو آپ اپنے ساتھیوں سے الگ
ہو کر ایک طرف تشریف لے گئے اور آپ نے لنگی باندھ کر کپڑے ایک
درخت پر پھیلا دیے اور خود اُس کے نیچے لیٹ گئے اس انتظار میں کہ
کپڑے خشک ہوں، تو انھیں پہن کر اپنے لشکر گاہ کی طرف واپس جائیں
ادھر اُدھر کے صحرائی عرب اس صورت حال کو دیکھ رہے تھے اور انھیں
دعثور کے جائے قیام کا علم تھا جو اس قبیلہ کا سردار اور بہادر آدمی تھا
چنانچہ ان میں سے کسی نے جا کر اُسے اطلاع دے دی کہ محمدؐ اس وقت تنہا
ہیں اور یہی موقع ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔ اُس نے ایک بڑی کاٹ دار
تلوار منتخب کی اور اُسے لیے ہوئے آ کر پیغمبرؐ کے سرہانے کھڑا ہو گیا اور
کہنے لگا کہ محمد! اس وقت تمھیں مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ نے بغیر اپنی
جگہ سے جنبش کیے ہوئے اسی طرح لیٹے لیٹے فرمایا کہ اللہ۔ بس اس لفظ
نے جو اس عزم و اطمینان کے ساتھ زبان سے ادا ہوئی تھی اُس کے ہاتھوں
میں لرزہ ڈال دیا ایسا کہ تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اب آپ نے تلوار کو اپنے
ہاتھ میں لے لیا، کھڑے ہو گئے اور فرمایا اب بتاؤ تمھیں مجھ سے کون
بچائے گا؟ اُس نے کہا کوئی نہیں اور بس اُس نے کلمۂ شہادتین زبان پر
جاری کیا۔ کہا بخدا اب میں آپ کے خلاف لشکر کشی کبھی نہ کروں گا۔ پیغمبر خداؐ
نے اُس کی تلوار اُسے دے دی اور وہ اُسے لیے ہوئے واپس چلا گیا اور اپنی

قوم کو بھی دعوت اسلام دینے میں مصروف ہو گیا۔[1]

غزوۂ بحران (یہ لفظ ب کے زیر اور پیش دونوں کے ساتھ بولی جاتی تھی، یہاں بنی سلیم رہتے تھے۔ اس لیے ابن سعد نے طبقات میں اسے "غزوۂ بنی سلیم" کہا ہے یہ ہجرت کے ستائیسویں مہینے ہوا تھا۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ مکّہ والے قبیلۂ قریش نے وہاں آکر ان کے ساتھ سازباز کی تھی اور ان دونوں نے مل کر جنگ کا منصوبہ بنایا تھا اس لیے تاریخ رقم طراز ہے کہ۔

غزا یرید قریشاً و بنی سلیم۔ | حضرتؐ، قریش اور بنی سلیم کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے۔

اور فرع کے علاقہ میں مقام بحران تک تشریف لے گئے اور ربیع الثانی اور جمادی الاول کے دو مہینے وہاں گزارے مگر مقابلہ کی نوبت نہیں آئی۔[3]

سبطِ اکبرؑ کی ولادت

۱۵ ماہ رمضان ۳ھ کو حضرت پیغمبر خداؐ کی اکلوتی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ کے یہاں پہلے فرزند کی ولادت ہوئی، جس کا نام ہدایت ربانی سے رسول خداؐ نے حسنؑ رکھا۔ اس کی خوشی پیغمبر خداؐ کو اتنی ہی

---

[1] اعلام الوریٰ [2] اعیان الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۱۷۷ [3] طبری جلد ۳ صفحہ ۲

نہ تھی جتنی ایک نانا کو نواسے کی ولادت سے ہونا ہی چاہیے، بلکہ آپ کو اس حیثیت سے بھی بڑی خاص مسرت ہونا چاہیے تھی کہ آپ کی رسالت کے سچے ہونے کا ایک بڑا ثبوت آج سے سامنے آنا شروع ہوا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ کفار و مشرکین پیغمبر خدا کے لیے بطور طعن و تشنیع کہتے تھے کہ یہ ابتر ہیں یعنی ان کی نسل چلنے والی نہیں ہے، کہنے والے وہ مشرکین تھے جن میں سے ہر ایک اولاد کی نعمت سے بہرہ یاب تھا، مگر ان کے جواب میں قرآن کا سورہ کوثر اترا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ خالق نے رسولؐ کو کثرت نسل کی دولت عطا کی ہے اور جو ان کے دشمن ہیں انہی کی نسل دنیا میں باقی نہ رہے گی۔ یہ اعلان موجودہ صورت حال کے بالکل برعکس تھا۔ اس لیے اُس کی سچائی آپ کی رسالت کی حقانیت کا ایک بڑا معیار بن گئی تھی۔ اب آج دنیا آنکھوں سے دیکھ سکتی ہے کہ وہ جن کی آل اولاد بہت تھی کس طرح دنیا میں بے نشان ہیں۔ اور پیغمبر خدا کی اولاد سے بفضل ربانی دنیا کا کوئی گوشہ تقریباً خالی نہیں ہے۔ یہ ہے سورہ کوثر کی واقعاتی تفسیر جو جیتی جاگتی شکل میں سادات کے وجود کے ساتھ موجود ہے، اور اس تفسیر کے سلسلہ کی پہلی کڑی یا اس کتاب مبین کی پہلی سطر تھی جو صفحۂ وجود پر حضرت امام حسنؑ کے ساتھ ظہور میں آئی تھی۔

اس طرح آپ رسولؐ کے لخت جگر ہونے کے علاوہ آپ کی حقانیت کا ایک زندہ معجزہ بن کر دنیا میں آئے تھے۔

جنگِ اُحد

سببِ جنگ اس جنگ کا سبب بالاتفاق مشرکین کا جذبۂ انتقام تھا۔ چنانچہ مسٹر کے، اے حمید بیرسٹر لاہور بھی لکھتے ہیں کہ:-

"بدر کی لڑائی کی شکست کے بعد قریش کا جذبۂ انتقام بھڑک اُٹھا۔ انھوں نے نہایت وسیع پیمانہ پر فوجی تیاریاں شروع کیں تاکہ وہ انتقام لے کر شکست کا دھبّا اپنے دامن سے دھونے میں کامیاب ہوں۔ مکہ میں چندے کی فہرستیں کھولی گئیں تقریروں سے عوام میں جوش پھیلایا گیا، لات اور عُزّےٰ کی قسمیں دے کر اُن کے ناموس بچانے کے لیے کہا گیا۔ مشہور شاعر ابو عزہ نے لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ قریش کی امداد کریں"۔[۱]

سب سے زیادہ جوش انتقام کا ابو سفیان کو تھا۔ ایک تو اس لیے کہ جنگ بدر کا بانی مبانی وہی تھا، لہذا تمام لوگ اپنے جانی و مالی نقصان کا اُسے ذمّہ دار سمجھتے تھے۔ پھر یہ کہ خود اُس کا بیٹا حنظلہ اس جنگ میں قتل ہوا تھا، اور اُس سے زیادہ جذبۂ انتقام اُس کی بیوی ہندہ کو تھا جسے اپنے بیٹے کے علاوہ اپنے باپ عتبہ اور چچا شیبہ اور بھائی ولید ان تینوں کا بھی داغ اُٹھانا پڑا تھا لہذا اگر

---

[۱] تاریخ مسلمانانِ عالم حصۂ اول صـ۷۵

ابوسفیان خاموش رہنا بھی چاہتا تو ہندہ اُسے خاموش رہنے نہیں دے سکتی تھی، چنانچہ یہ پہلے آچکا ہے کہ ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک پیغمبر اسلامؐ سے جنگ نہ کرے گا اُس وقت تک وہ نہائے گا نہیں۔ اگرچہ ایک مضحکہ خیز انداز سے اُس نے جنگ کا شگون کرکے نہانا شروع کر دیا تھا مگر ظاہر ہے کہ اُس کے جذبۂ انتقام کو اس سے تسلّی کہاں ہو سکتی تھی۔

عربوں کا عقیدہ تھا کہ قتل ہونے والوں کا اگر ماتم کر لیا جائے اور رو کر دل کی بھڑاس نکال لی جائے تو جذبۂ انتقام سرد پڑ جاتا ہے چنانچہ یہ بھی ذکر پہلے آچکا ہے کہ اس کی شدید تاکید کی گئی تھی کہ کوئی شخص بدر کے مقتولین کو روئے نہیں۔ یہ وہی سکوت و سکون تھا جو شدید آندھی کے پہلے والے سناٹے میں ہوا کرتا ہے۔

جنگ کی تیاریاں } سامانِ جنگ کی فراہمی میں سب سے مقدم روپیہ ہوتا ہے، اُس کے لیے عبداللہ بن ابی ربیعہ، عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیّہ اور بہت سے وہ جن کے باپ، بھائی، بیٹے بدر میں قتل ہوئے تھے، سب مل کر ابوسفیان کے پاس آئے، اور اُن رؤسا کے پاس جن کے اموال تجارت ابوسفیان والے قافلہ میں تھے اور انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مرتبہ کی تجارت میں جتنی رقم حاصل ہوئی ہے وہ سب پیغمبر اسلامؐ سے جنگ کے لیے دے دی جائے۔ یہ تمام لوگ اس تجویز سے

متفق ہو گئے اور اس طرح مالی حیثیت سے پورا اطمینان ہو گیا۔ فوج کی فراہمی کے لیے متعدد صاحب اثر اور زباں آور اشخاص اطراف کے قبائل میں دورہ کے لیے نکلے۔ ابو عزہ عمرو بن عبداللہ جمحی ایک ممتاز شاعر تھا، باوجودیکہ پیغمبرؐ کا احسان اس پر تھا کہ یہ بھی بدر میں اسیر ہوا تھا، مگر اس نے پیغمبرؐ سے التجا کی کہ میں غریب ہوں اور لڑکیاں رکھتا ہوں تو مجھے بغیر فدیے کے چھوڑ دیجیے۔ حضرتؐ نے اُس کی التجا قبول فرمائی اور اُسے رہا کر دیا۔ اُس کا ضمیر اس احسان کے بار کو محسوس بھی کر رہا تھا، چنانچہ پہلے اُس نے مشرکین کے ساتھ تعاون سے یہی کہہ کر انکار بھی کیا مگر پھر اُن لوگوں نے اُس کو آمادہ کر لیا کہ تم خود چاہے جنگ میں نہ جانا مگر اپنی زبان سے ہمیں تقویت پہنچاؤ۔ چنانچہ وہ تہامہ کے علاقہ میں قبیلہ کنانہ کو جنگ پر آمادہ کرنے کے لیے نکلا اور دوسرے اشخاص دوسرے اطراف کی طرف گئے۔ جبیر بن مطعم نے جس کا چچا طعیمہ بن عدی بدر میں قتل ہوا تھا اپنے حبشی غلام وحشی کو بلایا، جو حبش والوں کے طریقہ پر ایک حربہ کا پھینک کر نشانہ لگانے میں بڑا ماہر تھا، اُس سے کہا کہ اگر تم میرے چچا طعیمہ کے بدلے میں محمدؐ کے چچا (حمزہ) کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں تمھیں آزاد کر دوں گا۔ بعض راویوں نے حمزہ کے ساتھ رسولِ خداؐ اور حضرت علیؑ کا نام بھی لیا ہے کہ آزادی کو ان میں سے کسی کے بھی قتل کر دینے سے مشروط کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے گھرانوں کی

عورتیں ساتھ لی گئیں تاکہ ناموس کے خیال سے لوگ میدان جنگ سے فرار نہ کریں۔ تاریخ میں ان میں سے خاص خاص عورتوں کے جو ممتاز حیثیت رکھتی تھیں نام موجود ہیں، چنانچہ سردار فوج کے ساتھ جو ابو سفیان تھا اُس کی بیوی ہند بنت عتبہ بن ربیعہ تھی۔ اسی طرح عکرمہ بن ابی جہل کے ساتھ ام حکیم بنت حارث اور اُس کے چچا حارث بن ہشام کے ساتھ فاطمہ بنت ولید اور صفوان بن امیہ کے ساتھ برزہ یا برہ بنت مسعود اور عمرو بن عاص کے ساتھ عبداللہ بن عمرو بن عاص کی ماں ریطہ بنت منبہ بن حجاج اور طلحہ بن ابی طلحہ کے ساتھ سلافہ بنت سعد۔ یہ تمام عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ تھیں، اور خناس بنت مالک اپنے بیٹے ابو عزیز بن عمیر کے ساتھ تھی۔ سب سے زیادہ ہند بنت عتبہ سپاہیوں کو جوش دلاتی تھی اور خصوصیت کے ساتھ اُس حبشی غلام وحشی کو جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔[1]

{مدینہ پر حملہ} ان تمام تیاریوں کے بعد جو پورے ایک سال تک ہوئی تھیں ابو سفیان کی سرکردگی میں فوج روانہ ہوئی اور مدینہ سے بالکل متصل کوہ اُحد کے دامن میں پہونچ کر اُس نے اپنے مورچے جمائیے۔ سواد اعظم کے مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت پیغمبر خدا کا رجحان یہ تھا کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے۔ اکثر انصار بھی یہی کہہ رہے تھے، اور ایک روایت کے

---

[1] طبری، ج ۳ صـ۱۰

مطابق راس المنافقین عبداللہ بن اُبی نے بھی یہی کہا کہ ہمارے شہر کے اندر جب بھی کوئی داخل ہوا ہے تو ہم نے اُسے شکست دی ہے۔ مردانِ جنگی شہر کے دروازوں پر رہ کے مقابلہ کریں اور بوڑھے، بچے اور عورتیں کوٹھوں پر سے سنگ باری کریں تو دشمن کی مجال نہیں کہ وہ ہمارے شہر پر قبضہ کر سکے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبی نے باہر نکلنے کی رائے دی اور کہا ان کتوں سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔

کچھ سادہ لوح مسلمان جوشِ شہادت میں اس پر اصرار کرنے لگے۔ غرض کہ شوریٰ کے موقع پر اکثریت اس پر ہو گئی کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے اور مجلس مشاورت کے اس فیصلہ کے احترام میں پیغمبرؐ روانگی کے لیے تیار ہو گئے، مگر جب حضرتؐ چلنے لگے تو یہ سب حضرات جنھوں نے باہر نکلنے کی رائے دی تھی اپنے اس اصرار پر پشیمان ہوئے اور آ کر رسولؐ سے عرض کیا کہ جو آپ کی رائے تھی اُسی پر عمل کیجیے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا کہ نہیں، ایک رسولؐ جب جنگ کا لباس پہن کر تیار ہو جائے تو پھر اُسے واپس نہیں ہونا چاہیے[۱]۔

ہمارے نزدیک پیغمبرِ خداؐ کے افعال کی بنیاد وحیِ ربانی پر ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ خالق کی حکمت متقاضی ہوئی ہو، بالخصوص اس جنگ کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے کہ مسلمانوں پر اتمامِ حجت کر دی جائے اور

---

[۱] طبری، ج ۳ صـ۱۱

جب کہ باہر نکل کر مقابلہ اُن کی رائے سے ہوا تھا تو اب جو عملی کمزوری اُن کی، سامنے آئے اُس کا مواخذہ اُن سے شدید تر ہو جائے کہ خود ہی تو تم نے باہر نکلنے پر اصرار کیا اور خود ہی میدان جنگ سے فرار اختیار کیا۔

بہرصورت اس واقعہ میں اُن لوگوں کے لیے کافی سامان بصیرت ہے، جو شوریٰ اور کثرت رائے کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ صورت واقعہ سے ظاہر ہے کہ خود شوریٰ کرنے والوں نے بعد میں یہ احساس کیا کہ ہمارا طرز عمل غلط تھا اور خود ہی پھر رسولؐ سے اس کے خلاف عمل کی تحریک کرنے لگے، پھر جب پیغمبر خداؐ کے سامنے مجلس شوریٰ کا فیصلہ مجروح ہو گیا تو پیغمبرؐ کے بعد اگر کوئی شوریٰ ہو تو اُسے غلطی سے معصوم کیونکر مانا جا سکتا ہے۔

پیغمبرؐ کی روانگی تاریخ کا بیان ہے کہ قریش اپنے مورچہ پر کوہ احد کے دامن میں چہار شنبہ کے دن آ گئے تھے مگر حضرت پیغمبر خداؐ نے اس کے بعد تین دن توقف فرمایا اور جمعہ کی نماز مدینہ ہی میں پڑھائی۔ اتفاق سے اُس دن مسلمانوں میں سے ایک انصاری کا قبیلہ بنی نجار میں سے جن کا نام مالک بن عمرو تھا انتقال ہو گیا۔ حضرت پیغمبر خداؐ نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کے بعد مشرکین کے مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے اور روز شنبہ ۱۵ ماہ شوال کو اُن سے مقابلہ ہوا۔

علامہ سید محسن امین ۷ شوال اور بقولے ۱۵ شوال روز شنبہ

سے رہ سکتے ہیں۔ ہجرت کے بتلیس مہینے بعد۔

تعداد فوج مشرکین کی تعداد اس جنگ میں تین ہزار تھی اور بقول دوسرے پانچ ہزار۔ ان کے مقابلہ میں حضرت پیغمبر خدا ایک ہزار اصحاب کو لے کر نکلے مگر عین موقع پر جنگ کے کچھ ہی پہلے عبداللہ ابن اُبی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس چلا گیا، یہ اس کا ثبوت ہے کہ اُس کی رائے وہی تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کیا جائے چنانچہ یہی کہہ کر وہ واپس ہوا کہ انھوں نے میرا کہنا نہ مانا۔ اب میں اپنے کو اور اپنی جماعت کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔

اس طرح لشکر اسلام کی تعداد سات ہی سو رہ گئی اور یہ پہلی ضرب تھی جو مسلمانوں کی اخلاقی طاقت پر لگی، جس نے دوسروں کے بھی عزم و استقلال میں رخنہ پیدا کیا، چنانچہ بنی سلمہ اور بنی حارثہ دو قبیلے اور واپسی کا ارادہ کرنے لگے مگر پھر کچھ سوچ سمجھ کر انھوں نے اس ارادہ کو ترک کر دیا جس کا تذکرہ قرآن مجید کے ان الفاظ میں ہے کہ:-

اذ ھمت طائفتان منکم ان تفشلا۔	جب کہ دو گروہوں نے تم میں سے ارادہ کیا کہ وہ جمل میں کمزوری دکھلائیں۔

مشرکین میں سات سو زرہ پوش تھے اور مسلمانوں میں صرف سو کے جسم پر زرہیں تھیں۔ وہاں دو سو گھوڑے تھے اور یہاں اس

لے اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۱۷۷   ۲ے اعلام الوریٰ۔

۳ے طبری، ج ۳ ص ۱۲

جنگ میں بھی کل جمع دو ہی گھوڑے تھے۔[1]

سن و سال کا جائزہ اور مسلمان بچوں کا جوش مسلمان فوج میں بہت سے بچے شامل ہو گئے تھے۔ رسول خدا نے جو اپنی فوج کا جائزہ لیا تو کئی بچوں کو سن کی کمی کی بنا پر واپس فرما دیا جیسے زید بن ثابت، عبداللہ بن عمیر، اسید بن ظہیر، براء بن عازب، عرابہ بن اوس اور ابو سعید خدری مگر اس موقع پر بعض بچوں کا ولولۂ جہاد قابل قدر سمجھا گیا جیسے رافع بن خدیج، یہ بھی کم سن تھے، مگر جب بچے آپ کے سامنے لا کر کھڑے کیے گئے تو یہ بڑی بے تابی سے اپنے پنجوں پر زور دے دے کر کھڑے ہوتے تھے کہ قد ان کا چھوٹا معلوم نہ ہو۔ حضرتؐ نے اس شوق و ذوق کو محسوس فرمایا اور کہا اس بچہ کو ساتھ چلنے دو۔ جب رافع کو آپ نے اس طرح اجازت دے دی تو سمرہ بن جندب نے جو کم سنی کی بنا پر واپس کیے جا چکے تھے اپنے سرپرست کے ذریعے پیغمبرؐ کی خدمت میں کہلوایا کہ آپ نے رافع کو جنگ میں جانے کی اجازت دے دی ہے مگر میں یہ دعوے رکھتا ہوں کہ رافع سے کشتی لڑوں تو رافع کو پچھاڑ دوں گا۔ حضرتؐ کو یہ طفلانہ استدلال بھی پسند آیا اور فرمایا اچھا تو پھر میرے سامنے کشتی ہو جائے چنانچہ کشتی ہوئی اور واقعی سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا جس پر حضرتؐ نے سمرہ کو بھی شرکت جنگ کی اجازت دے دی۔[2]

---

[1] طبری، ج ۳ ص ۱۲ [2] طبری، ج ۳ ص ۱۲-۱۳

یہ مسلمانوں میں بچپن سے اس ذہنیت کی ہمت افزائی تھی کہ وہ راہ حق میں مرنے مارنے کو کھیل سمجھیں اور کسی خطرہ اور دہشت کا احساس دل پیدا نہ ہونے دیں۔

لشکروں کی ترتیب اور جنگ کے انتظامات مشرکین نے اپنے لشکر کو مرتب کیا اس طرح کہ میمنہ کا افسر خالد بن ولید کو بنایا اور میسرہ کا عکرمہ بن ابی جہل کو، اور علم لشکر طلحۃ بن ابی طلحہ کے سپرد کیا۔ پیغمبر خدا نے اپنے یہاں کی مورچہ بندی اس طرح کی کہ کوہ احد کو حفاظت کے لیے پشت پر رکھا کہ دشمن پشت کی طرف سے حملہ آور نہ ہو جائے۔ اس کے لیے آپ نے پچاس تیر اندازوں کے ایک دستہ کو قبیلہ عمرو بن عوف کے ایک بہادر عبید اللہ بن جبیر کی سرکردگی میں اس درّہ کے دہانے پر مقرر فرمایا، اس ہدایت کے ساتھ کہ ہمیں چاہے فتح ہو چاہے شکست، تم بغیر ہماری ہدایت کے یہاں سے نہ ہٹنا[۱]

پیغمبر خدا نے مہاجرین کا علم حضرت علی ابن ابی طالب کو سپرد کیا، اور انصار کا علم بردار سعد بن عبادہ کو بنایا اور انصار کی ہمت افزائی کے لیے حضرت خود اسی علم کے نیچے تشریف فرما ہوئے۔ علامہ طبرسی نے ایسا ہی لکھا ہے[۲]۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ آپ نے اس جنگ میں

---

[۱] طبری ج ۳ ص ۱۳

[۲] اعلام الوریٰ۔

تین علم مرتب فرمائے تھے مگر وہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ:۔

و رایت مہاجرین بہ علی مرتضےٰ داد۔ ؎۱	آپ نے مہاجرین کا علم حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو مرحمت فرمایا۔

مشرکین کے بڑے گھروں کی پندرہ ؎۱ خواتین جن میں سے کچھ کا نام بہ نام ذکر پہلے آچکا ہے اور یقیناً اُن کے ساتھ کنیزیں وغیرہ بھی ہوں گی یہ تمام میدان جنگ میں سپاہیوں کو جوش دلانے کے کام کو انجام دے رہی تھیں، چنانچہ ہندہ اور معاویہ کے اشعار اس موقع کے تاریخ میں مشہور ہیں:۔

نحن بنات طارق	ہم ہیں ستارۂ فلک کی بیٹیاں جو ناز و
نمشی علے النمارق	نعمت سے ریشمی مسندوں اور تکیوں پر پلے ہیں
ان تقبلوا نعانق	اگر تم قدم آگے بڑھاؤ گے تو ہم تمہارے گلے ملیں گے
او تدبروا نفارق	اور اگر تم نے پیٹھ پھرائی تو ہم جدا ہو جائیں گے
فراق غیر وامق ؎۲	ایسا جدا ہونا جس میں پھر محبت کا شائبہ بھی نہ ہوگا۔

ابوسفیان جو سالار لشکر تھا مجسم اپنے دونوں خداؤں یعنی لات و عزیٰ کو اپنے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے تھا ؎۳ تاکہ اُن کے پرستار اُن کی حفاظت کے لیے جان لڑا دیں۔

دست بدست مقابلہ } اُدھر سے طلحہ بن عثمان جو علم دار

؎۱ مدارج النبوۃ ؎۲ استیعاب مطبوعہ حیدرآباد ج ۲ ص ۲۸۶

؎۳ طبری ج ۳ ص ۱۲

لشکر تھا باہر نکلا اور پکار کر کہا، اے اصحاب محمدؐ تمھارا تو خیال ہے کہ جو تمھاری تلوار سے ہم میں کا قتل ہو وہ فوراً دوزخ میں جائے گا اور جو ہماری تلوار سے تم میں کا قتل ہو وہ سیدھا بہشت میں پہونچ جائے گا تو کیا کوئی ہے تم میں سے جو میری تلوار سے جلد بہشت میں پہونچ جائے یا مجھے اپنی تلوار سے جلد دوزخ میں پہونچا دے۔ یہ سنتا تھا کہ حضرت علی بن ابی طالبؑ کھڑے ہو گئے اور پکار کر کہا قسم ہے اُس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، میں تجھ سے الگ نہیں ہوں گا جب تک کہ جلد تجھے اپنی تلوار سے دوزخ میں نہ پہونچا دوں یا تو مجھے اپنی تلوار سے جلد بہشت میں نہ پہونچا دے۔ آپ نے جاتے ہی ایسی تلوار لگائی کہ اُس کا پیر کٹ گیا اور وہ گرا تو برہنہ ہو گیا اور کہنے لگا، میں تمھیں واسطہ دیتا ہوں اُس رشتہ کا جو ہمارے درمیان تھا کہ بس اب مجھے چھوڑ دو۔ فوراً آپ اُسے چھوڑ کر الگ ہو گئے اور دوسرا وار نہیں کیا مگر وہ ضرب ایسی تھی جس سے وہ جانبر نہیں ہو سکتا تھا۔ پیغمبر خداؐ نے صدائے تکبیر بلند کی، مگر جب حضرت علیؑ واپس آئے تو دوسرے اصحاب نے کہا کہ ارے آپ نے اُس پر دوسرا وار نہ کر دیا، آپ نے فرمایا کہ وہ برہنہ ہو گیا تھا اور پھر اُس نے مجھے قسم دے دی تو اب مجھے حملہ کرتے ہوئے شرم آئی[1]۔

تاریخ کے طالب العلم اسے عرصہ تک یاد رکھیں۔ اس لیے کہ فریق

---

[1] طبری، ج ۳ صفحہ ۱۵

مخالف نے اس نسخہ کو ہمیشہ کے لیے یاد کر لیا، چنانچہ صفین کی لڑائی میں شام کی فوج کے دو سورماؤں نے یکے بعد دیگرے علیؓ کی تلوار کی زد پر آنے کے بعد ارادۃً برہنہ ہو کر ہی جان بچائی۔ اس وقت تو لوگ یہی سمجھے کہ ان میاں سے پہلے نے دوسرے کے لیے مثال قائم کی مگر اب اُحد کے معرکہ کی روداد پڑھ کر پتہ چلا کہ یہ سبق اُن لوگوں نے اُحد کے علم دار مشرکین طلحہ سے حاصل کیا تھا مگر طلحہ کا کردار ایسا داغدار نہیں ہے جیسا ان مسلمان بہادروں کا اس لیے کہ وہ مہلک طور پر زخمی ہو چکا تھا تو یقیناً وہ غیر ارادی طور پر اس طرح گرا اور ان حضرات نے اس روایت کو صرف تدبیر جنگ کے طور پر عمداً دہرایا تھا۔

شاہ عبدالحق نے جو اس واقعہ کو درج کیا ہے اُن کا بیان ہے کہ تلوار سر پر پڑی تھی اور بھیجے تک اُتر گئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:۔

طلحہ بن ابی طلحہ کہ صاحب لواء قریش بود بر آمد و فریاد کرد و مبارز خواست و شیر بیشۂ ہیجا و ہزبر میدانِ وغا علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہ و کرّم اللہ وجہہ در میدان رفت و مبادرت نمود و تیغے بر سر وے زد کہ تا مغزش شگافتہ شد و باز گشت و بصف خویش آمد

طلحہ بن ابی طلحہ جو قریش کا علم دار تھا باہر نکلا، چیخا اور مبارزہ طلب کیا، ادھر سے نیستان جنگ کے شیر اور میدان نبرد کے ضرغام حضرت علی مرتضےٰ میدان میں گئے اور پیش دستی کی اور ایک تلوار اُس کے سر پر لگائی جس سے اُس کا سر بھیجے تک شگافتہ ہو گیا، اور پھر واپس چلے گئے اور اپنی صف میں آ گئے۔

یاراں گفتند کہ چرا کار طلحہ تمام
نہ ساختی جواب داد کہ چوں وے
بیفتاد عورتش ظاہر شد و مرا
سوگند داد کہ از مراد درگزرم
شرم داشتم کہ دیگر تعرض بوے
کنم و دانستم کہ عنقریب ہلاک
خواہد شد[1]۔

ساتھیوں نے کہا کہ آپ نے طلحہ کا کام تمام کیوں
نہیں کیا، جواب دیا کہ جب وہ گرا تو برہنہ
ہوگیا۔ اور مجھے اُس نے قسم دی کہ میں اُسے
اب چھوڑ دوں۔ مجھے شرم آئی کہ اب
اُس کے درپے ہوں۔ اور یہ مجھے معلوم
تھا کہ وہ بہت جلد ہلاک
ہوجائے گا۔

طلحہ کی ولدیت میں جو اختلاف نظر آتا ہے اُسے اختلاف نہیں سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ ابو طلحہ تو کنیت ہے۔ اس شخص کا کوئی نام تو ہونا ہی چاہیے۔ طبری نے اُس کے باپ کا نام بتایا ہے کہ وہ عثمان تھا۔ بے شک ضرب کی کیفیت میں اختلاف ہے، جس میں مجھے کسی حد تک ترجیح محدث دہلوی کی روایت کو محسوس ہوتی ہے اس لیے کہ پیر کا قطع ہوجانا گرنے کا باعث ہو سکتا ہے لیکن وہ بہت جلد ہلاکت کا سبب ہوجائے، ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ حضرت علیؑ کا یہ خیال کرکے واپس ہونا کہ یہ از خود بہت جلد ہلاک ہوجائے گا یہی بتاتا ہے کہ تلوار کاسہ سر پر پڑی تھی جس نے مغز تک شگاف ڈال دیا تھا۔ پھر یہ کہ ہمیں حضرت علی بن ابی طالبؑ کی ضرب کی عام کیفیت بھی یہی معلوم ہے کہ آپ یا سر پر تلوار لگاتے تھے اور یا کمر پر، شاذ و نادر پیر پر وار فرماتے تھے۔

۱؎ مدارج النبوۃ۔

گھمسان کی جنگ علم دار لشکر کے مارے جانے سے مشرکین کی کمر ٹوٹ گئی، اور اب کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وہ مبارز طلبی کو نکلے۔ اب طرفین سے عام حملہ ہو گیا جس میں حضرت علی بن ابی طالبؑ اور حضرت حمزہ ایسے ممتاز مجاہدوں کے علاوہ دوسرے مسلمانوں نے بھی کافی ہمت و جرأت سے مقابلہ کیا جن میں جناب مقداد بن اسود اور زبیر بن عوام کا نام تاریخ میں خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے۔

ایک اور مجاہد جن کا کارنامہ نمایاں ہے جناب ابو دجانہ انصاری ہیں۔ خود زبیر راوی ہیں کہ پیغمبر خدا نے، دفعۃً ایک تلوار ہاتھ میں اٹھائی اور فرمایا کون لیتا ہے اس تلوار کو اس شرط سے کہ اس کا حق ادا کرے۔ یہ کہتے ہیں کہ میں کھڑا ہو گیا اور میں نے کہا میں حاضر ہوں۔ آپ نے میری طرف سے منھ پھیر لیا۔ پھر فرمایا کون اس تلوار کو اس کا حق ادا کرنے کے ساتھ لیتا ہے۔ پھر میں کھڑا ہوا اور میں نے کہا یا رسول اللہ میں مگر پھر آپ نے منھ پھیر لیا۔ تیسری دفعہ جب یہی آواز بلند فرمائی تو ابو دجانہ سماک بن خرشہ کھڑے ہو گئے اور کہا میں اس کا حق ادا کرنے کے ساتھ اسے لوں گا، مگر بتا تو دیجیے اس کا حق ہے کیا؟ فرمایا حق اس کا یہ ہے کہ اس سے کبھی کسی مسلمان کو قتل نہ کرنا اور کسی کافر کے سامنے سے فرار نہ ہونا، چنانچہ حضرتؐ نے تلوار اُن کو دے دی اور اُن کا قاعدہ تھا کہ جب جنگ پر آمادہ ہوتے

لہ طبری، ج ۳، ص ۱۵

تھے تو پیشانی پر ایک عصابہ (پٹی) باندھ لیتے تھے۔ زبیر کا بیان ہے کہ میں بڑے اشتیاق کے ساتھ دیکھتا رہا کہ یہ آج کیا کرتے ہیں ؟ تو میں نے دیکھا کہ کوئی اُن کے سامنے نہیں آتا مگر یہ کہ وہ اُسے دو نیم کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اُن عورتوں تک پہونچ گئے جو دامن کوہ میں دف بجا بجا کر سپاہیوں کو جوش دلا رہی تھیں اور ان میں ایک عورت یہ اشعار پڑھ رہی تھی :—

نحن بنات طارق   ان تقبلوا نعانق

ونبسط النمارق   او تدبروا نفارق

فراق غیر وامق

(ذرا سے فرق کے ساتھ یہ وہی اشعار ہیں جو اس کے پہلے ہند بنت عتبہ کی زبانی درج ہو چکے ہیں، مگر زبیر نے اس بیان میں معلوم نہیں تقیہ سے یا کسی اور بنا پر اُس عورت کا نام نہیں لیا ہے جو یہ اشعار پڑھ رہی تھی، حالانکہ خود طبری نے پھر دوسرے مقام پر ان اشعار کے ساتھ ہند کا نام لیا ہے[1])

ابو دجانہ نے تلوار اُٹھائی کہ وہ اس عورت پر لگائیں مگر پھر تلوار روک لی، یہ دیکھ کر میں اُن کے سامنے گیا اور میں نے کہا کہ آج کی تمھاری پوری کارگزاری میں دیکھتا رہا ہوں مگر یہ کیا تھا کہ تم نے اُس عورت پر تلوار اُٹھائی، پھر ہاتھ روک لیا۔ انھوں نے کہا مجھے

---

[1] طبری، ج ۳، ص ۱۶

پیغمبر خدا کی تلوار کے لیے خلاف شان معلوم ہوا کہ میں اُس سے ایک عورت کو قتل کروں[۱]۔

دوسری روایت میں خود ابو دجانہ کا یہ بیان ہے کہ وہ عورت مردانہ وار بڑی بہادری سے لڑ رہی تھی۔ میں جب اُس کے قریب حملہ کے ارادہ سے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ عورت ہے اس لیے میں نے تلوار اُس کے مقابلہ میں روک لی[۲]۔

ابو سفیان نے اس موقع پر ایک چال چلی جو ناکام ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ اُس نے پکار کر جماعت انصار سے کہا کہ اے اوس و خزرج ہمیں تم سے لڑنا نہیں ہے۔ ہمیں اور ہمارے بھائیوں کو آپس میں مقابلہ کرنے دو اور تم واپس چلے جاؤ۔ ہم تم سے کوئی مزاحمت نہ کریں گے مگر انصار نے بہت تلخ الفاظ میں اُس کی اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔

مدینہ کے باشندوں میں سے ایک با اثر آدمی ایسا تھا جو پیغمبر خدا کی ہجرت کے بعد خفا ہو کے یہاں سے مکہ چلا گیا تھا اور اُس کے ساتھ مکہ کے پندرہ اور بقول بعض پچاس قبیلۂ اوس کے غلام بھی چلے گئے تھے۔ اُس نے قریش کو انصار کے متعلق بڑی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا اور کہا تھا کہ میں جب سامنے چلا جاؤں گا تو تمام اہل مدینہ ٹوٹ جائیں گے اور پیغمبرؐ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ یہ شخص ابو عامر تھا جو اس کے پہلے

---

[۱] طبری، ج ۳، صہ ۱۵
[۲] طبری، ج ۳، صہ ۱۷

مدینہ والوں میں اپنے زہد و تقوے کی شہرت کے باعث راہب یعنی تارک الدنیا کے لقب کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔ پیغمبر خدا سے مخالفت کے بعد اُسے یہاں عام طور سے فاسق کہا جانے لگا۔ اُحد کے میدان میں وہ بڑے طنطنہ کے ساتھ میدان میں آیا اور اُس نے پکار کر کہا اے میرے قبیلۂ اوس والو! میں ہوں ابو عامر، مگر اوس کے قبیلے کی طرف سے جواب ملا کہ خدا کی مار تجھ پر او فاسق! اپنی توقع کے خلاف یہ سُن کر وہ مارنے مرنے پر آمادہ ہو گیا اور بڑی شرارت کے ساتھ اُس نے جنگ کی۔ بالآخر قتل ہو گیا۔

مسلمانوں کی ابتدائی فتح اہل اسلام اور مشرکین میں گھمسان کا رن پڑا، جس میں تاریخ نے نمایاں حیثیت سے صرف تین نام لیے ہیں۔ طبری کے الفاظ یہ ہیں:-

وقاتل ابو دجانة حتی امعن فی الناس وحمزة بن عبد المطلب وعلی بن ابی طالب فی رجال من المسلمین فانزل الله عز وجل نصره وصدقهم وعده فحسوهم بالسیوف حتی کشفوهم وکانت الهزیمة

ابو دجانہ نے جنگ کی یہاں تک کہ مخالفین کا ستھراؤ کر دیا اور حمزہ بن عبد المطلب اور علی بن ابی طالب نے کچھ اور مسلمانوں کے ساتھ، تو اللہ نے اپنی مدد اتاری اور اپنا وعدہ اُن سے پورا کیا تو انھوں نے اُن کو تلوار سے اتنا مارا کہ انھیں ہٹا دیا اور شکست ہو گئی فوج مخالف کو

لا شك فيها | جس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہ تھی۔

ماضی قریب کے ہندوستانی مورخ علامہ شبلی کے الفاظ یہ ہیں:۔

" علمبرداروں کے قتل اور حضرت علیؓ اور ابو دجانہ انصاری کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، پری وش نازنین جو اپنے سُریلے رجزوں سے سپاہیوں کے دل ابھار رہی تھیں وہ بھی بدحواسی کے ساتھ ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا۔"[ملہ]

زبیر کا بیان ہے کہ میں اُن عورتوں کا جو ہند بنت عتبہ کے ساتھ آئی تھیں یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ وہ پائنچے اُٹھائے بھاگی جا رہی تھیں اور اُن کے گرفتار کیے جانے میں کوئی دشواری نہ تھی۔

مسلمانوں کا مال غنیمت پر ٹوٹنا اور جنگ کا بگڑ جانا

جنگ فیصلہ کن منزل تک پہونچ گئی تھی، مشرکین کی فوج قطعی طور پر پسپا کر دی گئی تھی اور لشکر کفار نے راہ فرار اختیار کی تھی۔ اب اموال غنیمت مجاہدین اسلام کا مطمح نظر بن گئے اور معزز صحابہ کی جماعت مال غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئی۔

وہ سپاہی جو پہاڑ کے دہانے پر اس ہدایت کے ساتھ کھڑے کیے گئے تھے کہ ہمیں چاہے فتح ہو چاہے شکست، تم یہاں سے بغیر حکم ثانی ملے ہوئے ہٹنا نہیں، انھیں بھی مال غنیمت کی فکر ہو گئی جب

لہ طبری، ج ۳، صلا   سلہ سیرۃ النبی ص ۲۷۶

وہ دیکھ رہے تھے کہ فوج کے سپاہی بے تحاشا مال لوٹنے میں مصروف ہیں۔ وہ سمجھے کہ اگر ہم یہیں کھڑے رہے تو ہمیں کچھ بھی نہ مل سکے گا۔ اس لیے وہ بھی اپنی جگہ چھوڑنے پر تیار ہو گئے، حالانکہ اُن کے سالار عبداللہ بن جبیر نے بہت منع کیا اور انھیں پیغمبر خدا کی صریحی ہدایت یاد دلائی مگر "حبّ دنیا"[1] کا وہ زور تھا کہ اُن کی اکثریت کسی طرح نہ رُکی، یہاں تک کہ عبداللہ بن جبیر کے پاس اکّا دکّا آدمی وہاں پر کھڑے رہ گئے اور باقی سب مال غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ دیکھا جائے تو ان لوگوں کی یہ ہوس اور پیغمبر کی عدول حکمی بجائے خود اگرچہ بہت قابل اعتراض ہے مگر اس کی کچھ ذمہ داری اصل فوج مجاہدین پر بھی عائد ہوتی ہے، اُن کو بھی یہ خیال کرنا چاہیے تھا کہ ہمارے کچھ بھائی پہاڑ کے دہانے پر روک دیے گئے ہیں۔ جب تک مشرکین اتنی دُور نہ چلے جائیں کہ اُن مجاہدین کو جو وہاں حفاظت کے لیے کھڑے ہیں واپس بُلایا جا سکے اُس وقت تک ہمیں ان اموال غنیمت کے لوٹنے کی طرف توجہ نہ کرنا چاہیے، مگر یہاں تو "زرطلبی" کی ایک آندھی چلی ہوئی تھی۔ یہ سوچنے اور کسی کا لحاظ کرنے کا وقت ہی

[1] یہ لفظ قرآن مجید کی اس صراحت پر مبنی ہے کہ: منکم من یرید الدنیا (یعنی) "تم میں کچھ دنیا کے طلبگار ثابت ہوئے" طبری کی روایت میں تشریح ہے کہ الذین ارادوا الغنیمۃ۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو مال غنیمت پر ٹوٹے" ابن مسعود کہتے تھے کہ آج سے پہلے مجھے تصور نہیں تھا کہ اصحاب رسولؐ میں کوئی ایک بھی "حبّ دنیا" میں گرفتار ہے، مگر اُحد میں پتہ چل گیا۔ (تاریخ طبری، ج ۳، صہ ۱۴۱)

کہاں تھا، پھر جب یہ لوگ اتنے بے تاب تھے تو وہ بھی تو سینوں میں ایسے ہی دل رکھتے تھے، وہ کیونکر پیچھے رہتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پہاڑ کے اُس دہانے پر ایسی طاقت نہ رہ گئی جو دشمن کو روک سکے، اُدھر مشرکین کی فوج کا ایک بڑا سورما خالد بن الولید اس دہانے کی تاک میں تھا۔ اُس نے جو یہ دیکھا کہ وہ سپاہی جو ادھر متعین تھے منتشر ہو گئے ہیں اور بس دو چار آدمی ہی کھڑے ہوئے ہیں تو وہ مشرکین کی فوج کے ایک دستہ کو لیے ہوئے اس طرف سے مسلمانوں پر حملہ آور ہو گیا۔ بچارے عبداللہ بن جبیر اور اُن کے ساتھ کے آدمیوں نے جو اب وہاں کھڑے تھے جان توڑ مقابلہ کر کے اپنی جانیں دے دیں، مگر وہ اس ریلے کو کہاں روک سکتے تھے۔ اُدھر سے اس حملہ کی کامیابی کو دیکھ کر اس طرف سے مشرکین کی اصل فوج بھی پلٹ پڑی۔ اب یہاں تو مسلمان مال غنیمت پر گرے ہوئے تھے اور اُدھر پشت پر سے مشرکین کی تلواریں برسنے لگیں۔ بس اب کیا تھا؟ کچھ جی دار مسلمان تھے جنھوں نے اپنے کو سنبھالا اور ایک دم لڑنے میں مصروف ہو گئے اور باقی تمام فوج اسلام کے قدم اُکھڑ گئے اور تلواریں لے کر حملہ آوروں کی طرف پلٹنے کے بجائے جس کا جدھر منھ تھا اُدھر ہی بھاگنے میں اُس نے اپنی نجات محسوس کی۔ پیغمبر خداؐ کے پاس تھوڑے سے آدمی جو رہ گئے تھے انھوں نے بلا ترتیب جو جہاں پر تھا وہاں پر لڑنا شروع کیا اس طرح کہ ان میں سے ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی۔ کسی طرف حمزہ، کسی طرف

ابو دجانہ اور کسی طرف علی بن ابی طالب اور ایسے ہی کچھ اور جان باز مجاہد جن میں سے اکثر بعد کو قتل ہو گئے یا زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ یہاں تک کہ ایک وہ وقت آیا کہ مشرکین نے اپنا پورا نصب العین پیغمبرؐ کی ذات کو بنا لیا۔ پتھر چلے ہوئے کہ آپ زخموں سے نڈھال ہو کر ایک گڑھے میں گر گئے، کسی نے غلطی یا شرارت سے یہ صدا بلند کر دی کہ آپ شہید ہو گئے۔ اب تو جو مسلمان آس پاس کچھ سوچ بھی رہے تھے کہ آگے بڑھ کر مقابلہ کیا جائے وہ یہ کہتے ہوئے کہ رسولؐ تو قتل ہو گئے، اب جنگ سے کیا فائدہ؟ دور دور بھاگ کر جانے لگے اور دوسروں کو بھی یہی کہہ کہہ کر اپنی جانیں بچانے کی تحریک کرنے لگے۔ تاریخ کے الفاظ ہیں:۔

تفرق عنہ اصحابہ و دخل بعضہم المدینۃ وانطلق بعضہم فوق الجبل الی الصخرۃ فقاموا علیہا و جعل رسول اللہؐ یدعوا لناس الیّ الیّ عباد اللہ[1]

آپ کے اصحاب آپ کے پاس سے اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور کچھ مدینہ میں چلے گئے اور کچھ پہاڑ کی چٹان پہ جا کر ٹھہر گئے اور حضرت پیغمبر خدا بہ آواز بلند پکارنے لگے لوگوں کو بلاتے ہوئے کہ میری طرف آؤ میری طرف اے بندگان خدا۔

اسی کو قرآن مجید نے کہا ہے:۔

---

[1] طبری، ج ۲، ص ۲۰

والرسول یدعوکم فی اخراکم	رسول تمہارے پیچھے سے تمہیں آواز دے رہے تھے۔

بدحواسی کا عالم یہ تھا کہ حذیفہ کے والد یمان جن کا نام حسیل بن جابر تھا خود مسلمانوں کی تلواروں سے شہید ہوئے۔[1]

ظاہر ہے کہ جب پوری فوج میں یہ افراتفری کا عالم ہو اور بھگدڑ پڑی ہوئی ہو تو میدان سے ہٹنے والوں کی مکمل فہرست بنانے کی تاریخ کو کیا ضرورت تھی۔ تاریخ ایسے ہی ناموں کو اس موقع پر محفوظ رکھ سکتی ہے جن کا میدان سے ہٹنا اُن کے خصوصیات کی بنا پر تاریخ کو غیر معمولی معلوم ہو، یا اُن افراد کے نام جو سب کے راہ فرار اختیار کرنے کے بعد میدان میں ثابت قدم رہ کے ایک غیر معمولی کردار کے حامل ثابت ہوں چنانچہ بلا تفریق فرقہ جمہور اسلام کے اہل قلم نے دونوں قسموں کے ایسے نام محفوظ کر دیئے ہیں جو ذیل کے اقتباسات سے ظاہر ہوں گے۔

انس بن نضر کی جانبازی حافظ ابن جریر کی روایت ہے:۔

انتھی انس بن نضر عم انس بن مالک الی عمر بن الخطاب وطلحۃ بن عبید اللہ فی رجال من المھاجرین والانصار وقد القوا	انس بن مالک کے چچا انس بن نضر (جو غالباً میدان اُحد میں نہ آئے تھے بس اس بھگدڑ یا رسولؐ کی شہادت کو سن کر میدان کی طرف روانہ ہوئے) ایک مقام پر پہونچے جہاں عمر بن خطاب اور طلحہ بن عبداللہ مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے ساتھ

[1] طبری، ج ۳، ص ۲۵-۲۶

بایدیھم فقال ما یجلسکم قالوا قتل محمدؐ رسول اللہ قال فما تصنعون بالحیاۃ بعدہ قوموا فموتوا علیٰ ما مات علیہ رسول اللہؐ ثم استقبل القوم فقاتل حتے قتلؓ۔

ہاتھ پاؤں ڈالے ہوئے ایک جگہ بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا ارے تم لوگ بیٹھے کیوں ہو؟ انھوں نے کہا کہ حضرت رسول خداؐ تو قتل ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ پھر تم لوگ اُن کے بعد زندہ رہ کر کیا کرو گے؟! اُٹھو اور اسی راستے پر جان دے دو جس پر رسولؐ دنیا سے اُٹھے۔ پھر وہ خود فوج کے مقابلہ میں پہونچ گئے اور جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔

اب طبری کی دوسری روایت میں یہ ملاحظہ کرلیجیے اور جتنی چاہیے عبرت حاصل کیجیے کہ یہ حضرات جنھیں انس بن نضر نے پہاڑ کی چٹان پر بیٹھے دیکھا تھا آپس میں گفتگو کیا کر رہے تھے ؟!

فشا فی الناس ان رسول اللہؐ قد قتل فقال بعض اصحاب الصخرۃ لیت لنا رسولا الی عبد اللہ بن اُبی فیاخذ لنا امنۃ من ابی سفیان یا قوم ان محمدا قد قتل فارجعوا الی قومکم قبل ان یأتوکم فیقتلوکم

لوگوں میں مشہور ہوا کہ رسول خداؐ شہید ہو گئے، تو اُن لوگوں میں سے جو پہاڑ کی چٹان پر بیٹھے تھے بعض نے کہا کہ کاش کوئی آدمی ایسا ہوتا جسے ہم عبد اللہ بن اُبی کے پاس بھیجتے کہ وہ ہمارے لیے ابوسفیان سے امان حاصل کرے۔ اے بھائیو! محمدؐ تو قتل ہو گئے تو اب اپنی قوم (مشرکین قریش) کی طرف واپس چلو قبل اس کے کہ وہ تم تک پہونچیں اور تمھیں قتل

لہ طبری، ج ۳، صـ ۲۰

قال انس بن النضر یا قوم ان کان محمد قد قتل فان رب محمد لم یقتل فقاتلوا علیٰ ما قاتل علیہ محمدؐ اللّٰھم انی اعتذر الیک مما یقول ھؤلاء وابرأ الیک مما جاء بہ ھؤلاء ثم شد بسیفہ فقاتل حتےٰ قتل۔[۱]

انس بن نضر نے کہا اے بھائیو! اگر محمدؐ قتل ہو گئے تو محمدؐ کا خدا تو قتل نہیں ہوا تو تم جنگ کرو اُسی راستے پر جس پر محمدؐ جنگ کر رہے تھے، خداوندا! میں تیری بارگاہ میں معافی کا طالب ہوں اُس سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں اور برا ءت کرتا ہوں اُس سے جو ان لوگوں نے کیا۔ پھر اپنی تلوار لے کر حملہ کیا اور جنگ کی یہاں تک کہ قتل ہو گئے۔

انس بن مالک کا بیان ہے کہ انس بن نضر کے جسم پر اُس دن تلواروں اور نیزوں کے ستر زخم پائے گئے۔ یہاں تک کہ اُن کی لاش کو کوئی پہچان نہ سکا۔ صرف اُن کی بہن نے اُن کی انگلیوں کی پوروں کے ایک خاص حُسن سے جو تھا اُس لاش کو پہچانا۔[۲]

دو نام تو ابھی انس بن نضر کے حال میں پسپا ہونے والے نمایاں چہرے آ چکے۔ فطری طور پر یہ اطمینان سے ہاتھ پاؤں ڈالے ہوئے بیٹھنا میدان جنگ سے کافی دور پر ہی ہو سکتا ہے جہاں اطمینان ہو کہ دشمن جلدی نہیں پہونچے گا، ورنہ اُس کے پہلے

---

[۱] طبری، ج ۳، ص ۲۰

[۲] طبری، ج ۳، ص ۱۹

ظاہر ہے کہ افتاں و خیزاں دشمن کی زد سے نکلنے ہی کی فکر ہو سکتی ہے جس کی کیفیت حضرت عمر نے اپنے متعلق خود یوں بیان کی ہے :-

لما کان یوم احد انہزمنا ففررت حتے صعدت الجبل فلقد رأیتنی انزو کاننی اروی[1]۔	جب احد کی جنگ میں ہم لوگوں کو شکست ہوی تو میں بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور میری یہ حالت تھی کہ میں جست و خیز کر رہا تھا جیسے بُز کوہی ہوتی ہے۔

مگر علامہ فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں :-

ومن المنھزمین عمر رضی اللہ عنہ الا انہ لم یکن فی اوائل المنھزمین و لم یبعد بل ثبت علے الجبل۔	پسپا ہونے والوں میں حضرت عمر بھی تھے مگر وہ پہلے بھاگنے والوں میں نہ تھے اور زیادہ دُور نہیں گئے تھے بلکہ پہاڑ پر ٹھہرے رہے تھے۔

طبری کا بیان ہے :-

وفرّ عثمان بن عفان وعقبۃ بن عثمان وسعد بن عثمان رجلان من الانصار حتے بلغوا الجلعب جبلاً بناحیۃ المدینۃ مما یلی الاعوص فاقاموا بہ ثلاثا ثم رجعوا	اور عثمان بن عفان اور انصار کے دو آدمی عقبہ بن عثمان اور سعد بن عثمان نے جب فرار کیا تو جلعب پہونچ گئے جو مقام اعوص کے قریب مدینہ کے پاس ایک پہاڑ ہے تو وہاں تین دن قیام کیا پھر رسول خدا کے

[1] تفسیر درّ منثور، سیوطی

الیٰ رسول اللہؐ فزعموا ان رسول اللہؐ قال لھم لقد ذھبتم فیھا عریضۃ[1]

پاس یہ لوگ واپس آئے تو ان لوگوں کا بیان ہے کہ رسولؐ نے اُن سے فرمایا کہ تم لوگ تو بڑے لمبے گئے۔

مستدرک حاکم اور قرۃ العینین شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ اقتباس نواب احمد حسین خاں (پریانواں) نے درج کیا ہے کہ:۔

عن عائشۃ قالت قال ابو بکر الصدیق لما جال الناس عن رسول اللہؐ یوم احد کنت اول من فاء الیہ فبصرت بہ من بعد فاذا انا برجل اعتنقنی من خلفی یرید رسول اللہؐ فاذا ھو ابو عبیدۃ الجراحؓ۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ فرماتے تھے کہ جب (احد) لوگ رسول اللہؐ کو چھوڑ کر منتشر ہو تو سب سے پہلے میں آپ کے پاس واپس آیا تھا تو میں نے دور سے آپ کو دیکھا اور اس وقت ایک شخص نے پیچھے سے آکر میرے گلے میں باہیں ڈال دیں یہ بھی رسول خداؐ کی طرف (واپس) آرہے تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ابو عبیدہ جراح تھے۔[2]

شاہ عبدالحق دہلوی نے اس بھگدڑ کی بڑی مکمل اور عبرت انگیز تصویر کھینچی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

اضطراب عظیم درمیان لشکر اہل اسلام پیدا شد و لشکر تمام از ہم فرو ریخت و از نہایت شوریدگی حال

زبردست ہل چل مسلمانوں کے لشکر میں پیدا ہوگئی اور فوج تمام تتر بتر ہوگئی۔ انتہائی بدحواسی سے جو اُن میں ہو گئی

---

[1] طبری، ج ۳، ص۲۱

[2] تاریخ احمدی ص۱۲۲

کہ بایشاں راہ یافتہ بود بقتل یکدیگر افتادند وشعور بشعار نہ داشتند چنانکہ گویند اسید بن حضیر را دو زخم از مسلمانان رسید و برابو بردہ نیز دو زخم رسید و یمان پدر حذیفہ بدست مسلمانان مقتول شد۔

اصحاب دراں حین بر چہار قسم شدند جمعے جنگ کردند و شہید شدند و گروہے گریختہ در زوایا و شعاب جبل مختفی گشتند و بعضے بشہر رفتہ قرار گرفتند و عثمان بن عفان از آنجملہ بود و بعد از اتمام معاملہ مقاتلہ و تسکین نائرۂ جنگ بخدمت مراجعت نمودند۔ جز چہار دہ نفر ہفت از مہاجرین و ہفت از انصار بادے کسے نماند۔

عجب است کہ در ایشاں عمر بن الخطاب را ذکر نہ کردہ اند۔[1]

[1] مدارج النبوۃ۔

تھی، خود آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے اور جو آپس کا علامتی نشان تھا اُس کا احساس نہ رہا چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اسید بن حضیر کو دو زخم مسلمانوں کے ہاتھ سے آئے اور ابو بردہ کے جسم پر بھی دو زخم لگے اور حذیفہ کے والد یمان مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اصحاب اس وقت چار گروہوں پر بٹ گئے تھے، ایک جماعت نے جنگ کی اور شہید ہوئے اور ایک گروہ بھاگ کر گوشوں اور پہاڑ کی گھاٹیوں میں چھپ گیا اور کچھ لوگوں نے شہر میں جا کر قرار لیا اور عثمان بن عفان انہی میں سے تھے۔ جنگ کا مرحلہ ختم ہونے اور آتش کارزار کے خاموش ہونے کے بعد خدمت رسولؐ میں واپس آئے۔ سوا چودہ آدمیوں کے سات مہاجرین میں سے اور سات انصار میں سے حضرتؐ کے پاس کوئی نہیں رہ گیا، حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں حضرت عمر کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

جن چودہؔ کے نام پیغمبرؐ کے پاس لیے گئے ہیں اُن میں بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کَے وہ تھے جو پورے طور پر ثابت قدم رہے اور کَے ایسے تھے جو کچھ دُور جا کر پھر کسی وجہ سے واپس آگئے چنانچہ ان میں حضرت ابو بکرؓ کا نام ہے مگر خود اُن کا قول اس کے پہلے درج ہو چکا ہے کہ جب لوگوں نے فرار کیا ہے تو میں سب سے پہلے واپس آیا تھا، یہیں آپ نے ایک دوسرے بزرگوار کے واپس آنے کا بھی ضمناً تذکرہ کر دیا ہے اور وہ ابو عبیدہؓ جراح تھے۔ پھر جنگ میں کارنمایاں کرنے والوں میں جناب طلحہ بن عبداللہ کا نام بھی تاریخ نے لیا ہے مگر انس بن مالک کے چچا انس بن نضر کی روایت پہلے درج ہو چکی ہے کہ اُنھوں نے حضرت عمرؓ کے ساتھ جن لوگوں کو دامن کوہ میں ہاتھ پیر ڈالے ہوئے بیٹھے دیکھا تھا اُن میں طلحہ بھی تھے جس پر انس نے بڑے تلخ انداز میں ملامت کی تھی اور جوش دلایا تھا اور خود جا کر دشمن کے مقابلہ میں مصروف جنگ ہو گئے تھے یہاں تک کہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ ممکن ہے کہ انہی کی نصیحت کے اثر سے بعد میں طلحہ بھی آکر جنگ میں شریک ہو گئے ہوں۔ پھر جنگ کے اختتام کے موقع پر بھی جیسا کہ بعد میں آئے گا، بڑی دیر تک رسولؐ کے پاس کوئی نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ واپس آئے ہوں تھے وہ بھی پھر تاب مقاومت نہ لا کر دوبارہ رخصت ہو گئے تھے۔ اس لیے بالآخر پھر رسول اللہؐ کے پاس سوا حضرت علی بن ابی طالبؑ کے کوئی بھی نہ تھا۔

وفاداروں کے کارنامے

ابو دجانہ انصاری کی شہادت ابو دجانہ نے اس جنگ کے پہلے دور میں بھی داد مردانگی دی تھی جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اب اس نازک مرحلہ پر جب کہ ساتھی منتشر ہو چکے تھے وہ حضرت پیغمبر خدا کے سامنے سپر بن کر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ وہ آپ پر جھک گئے تھے تاکہ کسی طرف سے آپ کو گزند نہ پہونچ سکے اور تیروں کو اپنی پشت پر لے رہے تھے، یہاں تک کہ بہت سے تیر اُن کے جسم میں پیوست ہو گئے بالآخر وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

مُصعب ابن عُمیر عرب میں بڑی لڑائیوں میں دو جھنڈے ہوتے تھے ایک بڑا ہوتا تھا جو رایت کہلاتا تھا، اور دوسرا چھوٹا ہوتا تھا جو لِوا کہا جاتا تھا، پیغمبر خدا کا رایت تو ہمیشہ حضرت علی بن ابی طالبؑ کے سپرد رہتا تھا مگر لوا کبھی کبھی کسی دوسرے کو بھی دے دیا جاتا تھا، چنانچہ جنگ احد میں جیسا کہ پہلے آچکا حامل رایت حضرت علیؑ تھے مگر لوا آپ کا جناب مصعب بن عمیر کے پاس تھا۔ جب جنگ میں شدت ہوئی تو مصعب جنگ کر کے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ طبری کے الفاظ یہ ہیں :-

مصعب بن عمیر نے پیغمبرؐ کے	وقاتل مصعب بن عمیر

سلہ طبری ج ۳ صفحہ ۱

دون رسول اللہؐ ومعہ لواؤہ حتے قتل وکان الذی اصابہ ابن قمیئۃ اللیثی وھو یظن انہ رسول اللہؐ فرجع الی قریش فقال قتلت محمدًا فلما قتل مصعب بن عمیر اعطی رسول اللہؐ اللواء علی بن ابی طالبؑ۔

سامنے جنگ کی اور اُن کے پاس حضرتؐ کا لوا تھا یہاں تک کہ وہ قتل ہو گئے اور جس نے اُن کو قتل کیا وہ ابن قمیئہ لیثی تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ رسول خدا ہیں تو وہ قریش کی طرف واپس گیا یہ کہتا ہوا کہ میں نے محمدؐ کو قتل کر دیا جب مصعب بن عمیر قتل ہو گئے تو رسول اللہؐ نے لوا بھی علی بن ابی طالبؑ کے سپرد کر دیا۔

اس روایت میں اس غلط افواہ کا کہ رسول خدا شہید ہو گئے ماخذ بھی بیان کیا گیا ہے، اس سے دو چار آدمیوں نے شاید غلط فہمی سے اور کچھ نے شرارت سے یہ خبر پھیلا دی اور ممکن ہے کہ جنگی سیاست کی بنا پر مسلمانوں کی ہمت اور زیادہ پست کرنے کے لیے اور مسلمانوں میں سے بھی کچھ منافقین نے دشمنوں کا آلۂ کار بن کر اس آگ کو اور ہوا دے دی۔

زیاد بن سکن ایک روایت میں نام ان کا عمارہ بن زیاد بن سکن لکھا ہے یعنی اس میں اختلاف ہے کہ یہ باپ کا واقعہ ہے یا بیٹے کا۔ انھوں نے کچھ انصار کے ساتھ رسولؐ کے سامنے جہاد کیا یہاں تک کہ ایک ایک کر کے وہ سب قتل ہو گئے۔ سب سے آخر میں یہ زخموں سے چور ہو کر گرے، اتنی دیر میں کچھ اصحاب واپس آ چکے تھے،

---

[1] طبری ج ۳ صفحہ ۱

یا ابھی وہ رسولؐ کے پاس باقی تھے، حضرتؐ نے فرمایا کہ انھیں میرے قریب لاؤ چنانچہ انھیں حضرتؐ کے پاس لاکر لٹایا گیا اس طرح کہ اُن کا رخسار حضرتؐ کے قدموں پر تھا اور اس عالم میں اُن کی روح نے جسم سے مفارقت کی۔

حنظلہ غسیل الملائکہ } یہ ایک نوجوان تھے جن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور شاید اسی لیے یہ مسلمانوں کی فوج کے ساتھ میدان جنگ میں نہیں گئے تھے مگر جب رسولؐ کی شہادت یا لڑائی کے بگڑنے کی وحشت ناک خبر مدینہ میں پہونچی تو یہ جوش وفاداری اور جذبۂ ایمانی میں بے تحاشا اُحد کی طرف روانہ ہو گئے اس حالت میں کہ انھوں نے غسل جو اُن پر واجب تھا نہ کیا تھا، میدان میں پہونچ کر یہ فوج مخالف پر ٹوٹ پڑے، اثنائے جنگ میں ان کی نظر سالار لشکر مشرکین ابوسفیان پر پڑ گئی اور یہ اُس سے دست و گریبان اور اُسے زمین پر گرا کے سینہ پر سوار ہو گئے۔ اُس کا کام تمام کرنا ہی چاہتے تھے کہ شداد بن اسود نے دوڑ کر ان پر تلوار ماری جو بھرپور پڑی اور وہ درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ بعد میں پیغمبر خدا نے بتایا کہ انھیں ملائکہ آسمان نے غسل دیا[١]۔ اس لیے وہ "غسیل الملائکہ" کہلائے، بعد میں اُن کی نسل بھی چلی جن کے نام کے ساتھ یہ لقب وابستہ رہا چنانچہ جب اہل مدینہ نے یزید کی بداعمالیوں کی بنا پر اُس کی بیعت توڑنے کا اعلان کیا تو

---

[١] طبری ج ٣ صفحہ ٢١

انہی حنظلہ کے بیٹے عبداللہ کو اپنا سردار قرار دیا تھا، پھر یوم حرّہ میں جب مدینۂ رسولؐ میں فوج یزید کے ہاتھوں قتل عام ہوا تو اس میں وہ شہید ہوئے۔

امّ عمارہ انصاریہ اس معرکہ میں ایک خاتون کی بھی جاں نثاری یادگار ہے، یہ میدان اُحد میں زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے آئی تھیں، مگر جب اُنھوں نے دیکھا کہ پیغمبرِ خداؐ پر دشمن حملے کر رہے ہیں تو یہ خاتون حضرتؐ کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور تیروں کو اپنے سینہ پر لینے لگیں، یہاں تک کہ جب نیزوں اور تلواروں سے مخالفین نے حملہ کیا تو اُنھوں نے بھی تلوار لے کر دشمنوں سے مقابلہ کیا یہاں تک کہ زخمی ہو گئیں[۱]۔ اس خاتون کا یہ جہاد اور مردانِ جنگی کی اکثریت کا کردار دونوں صفحۂ تاریخ پر عبرت کا سرمایہ ہیں۔

جناب حمزہ کا جہاد اور اُن کی شہادت پہلی دفعہ فتح کا سہرا جن مجاہدین کے سر تھا اُن میں جناب حمزہ کا نام آچکا ہے، جنگ بگڑنے کے بعد اُنھوں نے دوبارہ دشمن سے مقابلہ میں جان توڑ کوشش کی چنانچہ اُس مہم میں بھی جو علمدارانِ لشکرِ کفار کے قتل کرنے کی تھی جس کا ذکر بعد میں آئے گا جناب حمزہ نے شرکت کی اور علمداروں میں سے ایک ارطاۃ بن عبد شرحبیل بن ہاشم بن عبد مناف بن عبد الدار ابن قصی کو اُنھوں نے قتل کیا پھر اُن کی طرف سے سباع بن عبد العزےٰ

---

[۱] سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۸۳ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد ۱ صفحہ ۹۹

عنبشانی کا گزر ہوا جس کی کنیت ابو نیار تھی، وہ اس سے برسرِ پیکار ہو گئے اور اُسے کاری ضرب لگائی۔ ؎

جنگ کے لیے مشرکین کی تیاریوں کے ذیل میں وحشی کا ذکر آچکا ہے علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ یہ جبیر بن مطعم کا غلام تھا۔ جبیر کا چچا طعیمہ جنگ بدر میں حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ہاتھ سے قتل ہو چکا تھا، اس لیے جبیر کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وحشی ملک حبش کے ایک ہتھیار "حربہ" کے لگانے میں جو پھینک کر مارا جاتا تھا بڑی مہارت رکھتا تھا۔ جبیر نے اُسے بلا کر میدان احد میں جانے سے پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر خود محمد (رسول خداؐ) کو تو قتل کر دے تو آزاد ہو جائے گا اور اگر اُن کے چچا (حمزہ) کو قتل کر دے تو آزاد ہو جائے گا اور اگر اُن کے چچا زاد بھائی (حضرت علیؑ) کو قتل کر دے تو تو آزاد ہو جائے گا، چنانچہ وہ جنگ اُحد میں اس آزاد ہونے کی دُھن میں گیا۔ اس کا خود بیان ہے کہ رسولؐ کے قتل کر سکنے کی تو مجھے امید نہ تھی مگر خیال تھا کہ علیؑ یا حمزہؓ کو شاید دھوکے سے قتل کر دوں اور آزادی کی نعمت حاصل کروں ؎۔

شدت جنگ کے دوران میں جناب حمزہؓ کا مقابلہ سباع بن عبد العزےٰ سے ہو رہا تھا اور حمزہ اُدھر متوجہ تھے کہ وحشی نے موقع پا کر اپنے حربہ کو پوری قوت سے پھینکا جو جا کر آپ کے سینہ پر لگا اور سینہ و شکم کو چاک کرتا ہوا پیروں کے پاس گر گیا۔ حضرت حمزہ کی جرأت و ہمت وہ تھی کہ اس

؎ طبری، ج ۳ ص ۱۸ ؎ اعلام الوری

عالم میں بھی وہ وحشی کی طرف جھپٹے مگر ضعف سے تیورا کر گر گئے۔ اُن کے گرنے کے بعد بھی وحشی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ پاس آتا۔ جیسا کہ اُس نے خود بیان کیا ہے جب اُس نے محسوس کر لیا کہ اب ان کی روح نے جسم سے مفارقت کی تو وہ قریب آیا اور اُس نے اپنا حربہ زمین سے اُٹھا لیا اور پھر خاموشی کے ساتھ لشکرگاہ کی طرف واپس چلا گیا، اس لیے کہ اُسے اب جنگ کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی تھی، جو اس کا مطلب تھا وہ حاصل ہو گیا تھا۔[۱]

سعد بن ربیع } یہ انصار کے قبیلۂ بنی الحارث بن خزرج میں سے تھے یہ بھی اس جنگ میں شہید ہوئے۔ راوی کا بیان ہے کہ اختتام جنگ کے بعد رسولؐ نے فرمایا کون ہے جو سعد بن حارث کی خبر لائے کہ وہ زندوں میں ہیں یا مُردوں میں۔ ایک انصاری نے کہا کہ میں جا کر دیکھتا ہوں چنانچہ جا کر دیکھا تو اُنھیں زخموں سے چور پایا اس طرح کہ اُن میں بس رمقے جان باقی تھی۔ اُن کا بیان ہے کہ میں نے سعد کو بتلایا کہ رسول خداؐ نے تمھیں اس طرح دریافت فرمایا ہے، اُنھوں نے کہا بس جا کر بتا دو کہ میں مُردوں میں ہوں اور رسول خداؐ کو میرا سلام کہنا اور میری طرف سے یہ کہہ دینا کہ اللہ آپ کو بہترین وہ جزا عطا فرمائے جو کسی بھی نبی کو اُس نے عطا کی ہو اور میری قوم کو سلام پہنچا دینا اور اُن سے میری طرف سے کہہ دینا کہ جب تک تم میں سے ایک متنفس بھی زندہ ہے رسولؐ کا بال بیکا نہ ہونے پائے

---

[۱] طبری ج ۳ ص ۱۸

ورنہ روزِ قیامت خدا کے سامنے تمہارے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔
یہ کہنے کے بعد اُن کی روح نے جسم سے مفارقت کی۔[۱]

پیغمبرِ خداؐ پر حملوں کی شدّت

سابق زمانہ کے مؤرخین کی یہ عادت نہ تھی کہ وہ واقعہ کو مسلسل لکھیں۔ راویوں سے جو منتشر طور پر بیانات ملتے تھے اُنھیں پاشاں و پریشاں طریقہ پر درج کر دیتے تھے۔ راویوں نے بھی زیادہ تر تسلسل کے ساتھ پورا واقعہ بیان نہیں کیا بلکہ حسبِ موقع واقعہ کے جس جزو کے بیان کی جس وقت ضرورت محسوس ہوی بس اُتنا بیان کر دیا۔ اب بعد کے مؤرخین کو وہ سب بیانات یکجا ملتے ہیں تو ان میں ترتیب قائم کرنے میں بڑی دقت محسوس ہوتی ہے، اور اسی بے ترتیبی سے بعض وقت واقعات میں تضاد محسوس ہوتا ہے چنانچہ جنگِ اُحد کے حالات میں کہیں پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پیغمبرِ خداؐ کے پاس کچھ آدمی موجود ہیں۔ کہیں پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے آس پاس کوئی بھی نہیں ہے۔ ساتھ کے آدمیوں میں کبھی زیادہ تعداد نظر آتی ہے اور کبھی بہت مختصر۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ واقعہ کے بیان میں کوئی اختلاف کی صورت نہیں ہے بلکہ جنگ بگڑنے کے بعد یکے بعد دیگرے جنگ کے مختلف دَور سامنے آئے ہیں۔ پہلا دور وہ ہوگا جس میں اکثریت کے

---

[۱] طبری، ج ۳ صد ۲۴-۲۵

قدم اُٹھ گئے مگر حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ساتھ ابودجانہ انصاری، حضرت حمزہ اور شاید ڈیڑھ دو سو مجاہدین ابھی مصروف پیکار تھے جس کی قطعی دلیل شہدائے اُحد کی تعداد ہے جو متفق علیہ حیثیت رکھتی ہے یعنی ستر آدمی مسلمانوں میں سے شہید ہوئے۔ اگر یہ مانا جائے کہ پورے اسلامی لشکر نے فرار اختیار کیا تو آخر یہ مجاہدین کیونکر قتل ہوئے، ماننا پڑتا ہے کہ ایک معتدبہ تعداد ایسی تھی جو مصروف جہاد رہی اور ان کی دیکھا دیکھی بہت سے لوگ ابھی نتیجہ کے انتظار میں تذبذب کے عالم میں ہوں گے اور یہ وہ دور تھا جس میں براہ راست پیغمبر خداؐ پر حملے نہیں ہوئے ہوں گے اور نہ آپ کے جسم مبارک کے زخمی ہونے کی نوبت آئی ہوگی۔ اس کے بعد دوسرا دور وہ ہوگا جب جاں باز مجاہدین کی شہادت کی وجہ سے رفتہ رفتہ اُن کی تعداد تیزی کے ساتھ کم ہوتی گئی ہوگی، اس طرح وہ منزل آئی کہ اب پیغمبرؐ کے پاس اتنے سپاہی نہ رہ گئے جن کی وجہ سے آپ حملوں سے محفوظ رہ سکیں، اس وقت ایک موقع وہ آیا ہوگا جب مردانِ میدان میں آپ کے بالکل قریب ابودجانہ انصاری تھے اور اب ان کو بجائے دشمنوں سے بڑھ بڑھ کے جنگ کرنے کے یہی صورت جاں نثاری کی نظر آئی کہ وہ رسولؐ کے سامنے سپر بن کر کھڑے ہو جائیں جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے پھر ابودجانہ کی شہادت کے بعد وہ وقت آیا ہوگا کہ جب ام عمارہ کو اس کی ضرورت پڑی ہوگی کہ وہ پیغمبرؐ کی سپر بن کر دشمنوں کا

دفعیہ کریں، مگر ظاہر ہے کہ ایک خاتون کا بس کثیر التعداد دشمنوں سے کہاں چل سکتا تھا، ادھر میدان جہاد میں ایک حضرت علی بن ابی طالبؑ رہ گئے تھے جن کے کارنامۂ وفاداری کا ذکر ابھی آئے گا، وہ دشمنوں سے لڑنے میں مصروف تھے اور ادھر رسول خداؐ تھے جو اب دشمنوں کے حملہ کا مرکز بن گئے تھے۔

پیغمبر خداؐ اپنی زندگی کے عام حالات میں ہر موقع پر قوت اعجاز سے کام لینے پر مامور نہ تھے ورنہ مکہ والے تیرہ برس کی مدت میں اکثر اوقات جسم مبارک پر پتھر مارے نہ جا سکتے اور یا مارے جاتے تو حضرتؐ کے جسم اقدس تک نہ پہونچتے اور جنگ احد میں بھی کوئی زخم جسم اطہر پر ہر، ممکن نہ ہوتا مگر یہ امر خالق کے دستور و حکمت کے خلاف تھا۔ اس کے ساتھ رسول خداؐ کسی ایسی شریعت کے حامل نہ تھے جس میں مدافعانہ طور پر اسلحہ کا استعمال بھی ممنوع ہو بلکہ یہ وہ شریعت ہے جس میں حفاظت نفس کے لیے بھی دفاع ایک فریضۂ دینی ہے، لہذا یقین کرنا چاہیے کہ جب حملے ہونے لگے اس وقت آپ نے مدافعت بھی فرمائی ہوگی، چنانچہ تاریخی بیانات کی کم مائیگی کے باوجود جنگ احد میں دشمن کے مقابلہ میں آپ کی تیر اندازی کا بھی ذکر ملتا ہے[۵۱]۔ اور ایک بڑے نمایاں شخص کا مشرکین میں سے جو آپ کو شہید کرنے کے منصوبہ سے آپ کی طرف بڑھا تھا آپ کے ہاتھ سے قتل ہوا بھی، یہ شخص ابی بن خلف جمحی تھا۔

---

[۵۱] طبری، ج ۳ ص ۱۸

اگرچہ راویوں نے اُس کی ہلاکت کے اسباب میں روحانی اور نفسیاتی تاثرات کو بھی شریک کر دیا ہے، مگر یہ واقعہ مسلّم ہے کہ آپ نے اُس کی گردن پر نیزہ مارا اور اُس زخم سے وہ ہلاک ہوا۔ اگر آپ کو فقط اعجاز کی قوت سے کام لینا ہوتا تو نیزہ مارنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ حضرتؐ کا نگاہ غضب سے اُس کی طرف دیکھ لینا ہی کافی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ میں یہ شخص جب حضورؐ سے ملتا تھا تو کہتا تھا کہ میں اپنے مرکب کو روز نہ اس نیت سے دانہ کھلاتا ہوں کہ ایک دن میں اس پر بیٹھ کے تم کو قتل کروں گا تو رسالت مآبؐ فرماتے تھے نہیں بلکہ انشاء اللہ میں تمھیں قتل کروں گا۔ جنگ اُحد میں جب حضرتؐ کے پاس محافظین کی کمی ہو گئی اور دشمنوں کی ہمت بڑھی تو یہ شخص گھوڑا دوڑاتا ہوا حضرتؐ کی طرف قتل کے ارادہ سے آیا۔ رسول خداؐ چونکہ خود بہ نفس نفیس جنگ نہیں فرماتے تھے اس لیے آپ اپنے پاس زیادہ ہتھیار رکھتے بھی نہیں تھے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت آپ نے اپنے پاس کے ایک شخص حارث بن صمہ سے نیزہ لیا اور یہ نیزہ لے کر آپ ابی بن خلف کے مقابلہ پر آگے بڑھ گئے اور آپ نے ایک ہلکا سا وار اُس کی گردن پر کیا جس کا اثر یہ تھا کہ وہ گھوڑے پر سے گر کر کچھ دور تک لُنڈھکتا ہوا چلا گیا پھر آپ نے اُس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا اور وہ چیختا ہوا یہ کہتا ہوا اپنی فوج کی طرف بھاگا کہ بخدا محمدؐ نے مجھے مار ڈالا۔ لوگوں نے کہا کہ تمھارا دل اُلٹ گیا ہے، یہ زخم کون ایسا گہرا ہے جو باعث ہلاکت ہو۔ اُس نے

کہا اے مکہ میں وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں تمھیں قتل کروں گا۔ تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ میں اس زخم سے جانبر ہوں چنانچہ جنگ اُحد کے اختتام پر جب قریش واپس ہوئے تو مکہ کے راستے میں مقام سرف پر اُس کی روح جسم سے جُدا ہو گئی [۵۱]۔

اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص کی ہمت نہیں تھی کہ وہ حضرتؐ کی طرف بڑھے۔ اس لیے ایک بڑی جماعت نے مل کر آپؐ پر حملے شروع کیے۔ جن میں بہت سے لوگ پتھر برسا رہے تھے چنانچہ سر مبارک شگافتہ ہو گیا اور خون رُخ کے چہرہ پر آیا اور دہن مبارک پر بھی پتھر پڑا جس سے ہونٹ شگافتہ ہو گئے اور پیشانی و رخسار بھی زخمی ہوئے اور ابن قمیہ نے داہنے پہلو پر تلوار ماری [۵۲]۔

دوسری روایت یہ ہے کہ اسی نے وہ پتھر مارا تھا جس سے چہرۂ مبارک زخمی ہوا تھا اور دہن مبارک پر ضرب آئی تھی [۵۳]۔

علمائے شیعہ کسی حصۂ جسم کی کمی کو خلاف شانِ رسولؐ سمجھتے ہیں، اور شیعی روایت یہ ہے کہ کوئی دانت شکستہ نہیں ہوا تھا بلکہ چہرۂ مبارک زخمی ہوا تھا [۵۴]۔

پھر اور حربے ہوتے رہے، یہاں تک کہ وہیں پاس ایک گڑھا تھا جس میں ضعف سے نڈھال ہو کر گر گئے۔

---

[۵۱] طبری، ج ۳ ص ۱۹

[۵۲] طبری، ج ۳ ص ۱۷

[۵۳] طبری، ج ۳ ص ۲۰

[۵۴] اعلام الوریٰ

ممکن ہے یہ شہرت کہ آپ شہید ہو گئے ظاہری حیثیت سے آپ کی بقائے حیات کا سبب بن گئی ہو اس طرح کہ پھر مشرکین نے اُدھر توجہ نہ کی ہو اور یہ سمجھ لیے ہوں کہ آپ اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور اب اُن کی پوری توجہ حضرت علیؑ کے مقابلہ پر مرکوز ہو گئی جو دوسری سمت میں علم کو سرنگوں کرنے کی مہم میں مصروف تھے جس کا تذکرہ ابھی آئے گا۔

حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا بے مثال کارنامہ

جیسا کہ ہم نے درایت کے تقاضے سے بتایا کہ روایتیں جو حالات جنگ سے متعلق ہیں وہ مختلف ادوار سے تعلق رکھتی ہیں، اسی طرح حضرت علی بن ابی طالبؑ کے کارنامۂ وفاداری کے جو تفصیلات وارد ہوئے ہیں وہ بھی بلاشبہ جنگ کے مختلف دوروں سے متعلق ہیں۔

ایک دور وہ تھا جب آپ کے ساتھ مشرکین کی جنگ میں سو ڈیڑھ سو مجاہدین موجود تھے۔ پھر ایسا دور آیا ہوگا جس میں ساتھ والے ثابت قدم افراد رفتہ رفتہ سب شہید ہو گئے یا ایسے زخمی ہو گئے کہ جنگ کرنا اُن کے لیے ممکن نہ رہا اور جو ان کی دیکھا دیکھی کچھ داد شجاعت دے رہے تھے وہ رفتہ رفتہ میدان سے کھسک گئے اس طرح آپ نصرت اسلام میں تن تنہا رہ گئے ان تمام ادوار میں آپ کا کردار بہر صورت مثالی حیثیت رکھتا ہے۔

روایات اور واقعات کی درایتی رفتار دونوں کو سامنے رکھ کر ہم جو ترتیب قائم کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ پہلے جب ایک دم مشرکین کی

فوج نے پشت پر سے حملہ کر دیا اور مسلمانوں کی اکثریت نے بے تحاشا راہ فرار اختیار کی اور میدان میں ایک قلیل جماعت رہ گئی جو اس کثیر فوج کی یورش میں یکجائی منظم طاقت کی حیثیت بھی نہ رکھتی تھی بلکہ الگ الگ افراد تھے جو مصروف پیکار ہو گئے تو اُس وقت حضرت علی بن ابی طالبؑ نے اپنی خداداد بصیرت یا مادی تعبیر کی جائے تو جنگ کی بے مثال دستی مہارت سے یہ دیکھتے ہوئے کہ اتنی بڑی فوج کے ریلے کو چند آدمی نہیں روک سکتے اور نہ کسی ایک کے بس میں ہے کہ وہ اس پوری فوج کو تہ تیغ کر دے مگر بڑے سے بڑے مجمع کے خاص نفسیات ہوتے ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ ایسے چند افراد جو اُس کے سر غنہ ہیں اگر تہ تیغ ہو جائیں تو پوری جماعت کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور باوجود اپنی مادّی قوت کے اخلاقی طور پر شکست کھا کے ہمت ہار بیٹھتی ہے۔ لشکر میں اس طرح کی نمایاں حیثیت علمداروں کی ہوتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جنگ بدر میں بھی مشرکین نے اپنی شکست کا ذمہ دار اپنے علمداروں کی کمزوری کو قرار دیا تھا۔ چونکہ اب تک قریش میں علم برداری کا منصب بنی عبدالدار میں تھا تو ابو سفیان نے جنگ اُحد میں جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی بنی عبدالدار کے علمداروں کو پکار کر کہا تھا :-

یا بنی عبد الدار انکم ولیتم لواءنا یوم بدر فاصابنا ما قد رأیتم و	اے قبیلۂ عبدالدار والو! تم لوگ بدر کے دن ہمارے علمدار تھے تو ہم کو وہ مصیبت درپیش ہوئی جو تم سب نے دیکھی اور

انّما یؤتی الناس من قبل رایاتھم اذا زالت زالوا فاما ان تکفونا لواءنا و اما ان تخلّوا بیننا و بینہ فنکفیکموہ۔

[illegible]

تمام لوگوں کا دارومدار اُن کے علموں پر ہے۔ جب علم ہٹ جائیں گے تو وہ لوگ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے تو یا تم لوگ علم کو اچھی طرح سنبھالو اور یا پھر اُسے چھوڑ کر الگ ہو جاؤ۔ ہم خود

یہ سُن کر اُن سب کو جوش آ گیا اور کہا واہ! ہم اپنا منصب تمہارے سپرد کر دیں! دیکھنا جب مقابلہ ہوگا ہم کیا کرتے ہیں[۱]۔

جنگ اُحد کے پہلے ہی دور میں جیسا کہ اس کے پہلے آ چکا ہے ان کا سب سے بڑا علم دار طلحہ حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ہاتھ سے قتل ہو چکا تھا مگر ابھی متعدد علم دار موجود تھے۔

اب اس دوسرے سخت دور میں حضرت علی بن ابی طالبؑ نے اپنا پورا نصب العین یہ قرار دے لیا کہ کسی طرح کفار کے علم کو سرنگوں کر دیا جائے۔ اگر علم زمین پر آ گیا اور کوئی اُس کا اٹھانے والا نہ رہا تو پھر یہ فوج چاہے تعداد میں جتنی ہی زیادہ ہو شکست کھا کے رہے گی۔ غالباً آپ نے اپنے اس منصوبہ میں جناب حمزہ کو شریک کر لیا تھا، چنانچہ جیسا کہ پہلے آ چکا ہے علم داروں میں سے ایک جناب حمزہ کے ہاتھ سے قتل ہوا مگر مشرکین کے جو سربرآوردہ افراد تھے وہ بھی اس راز سے واقف تھے کہ اگر علم سرنگوں ہو گیا تو فوج نہیں ٹھہر سکتی، پھر

---

[۱] طبری، ج ۳ ص ۱۲

جیسا کہ ابھی آیا علم داروں کو خاص طور پر انتباہ بھی کیا جا چکا تھا اس لیے اُن کی جان توڑ کوشش یہ تھی کہ علم گرنے نہ پائے۔ ہندہ زوجۂ ابی سفیان بھی اب خصوصیت کے ساتھ انہی علم برداروں کو جوش دلا رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی:—

ویھا بنی عبد الدار	شاباش بنی عبد الدار! شاباش
ویھا حماۃ الادبار	پشت پناہ بن کر حمایت کرنے والو!
ضربا بکل بتار[۱]	شمشیر برّاں سے وار پہ وار کرتے رہو۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ادھر حضرت علی بن ابی طالبؓ، ایک علم اٹھانے والے پر ضرب لگاتے تھے، اُدھر فوراً ایک دوسرا آدمی اُس علم کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا کہ وہ سرنگوں ہونے نہ پائے، اُس وقت حضرت علیؓ کو صرف ہر علم دار کے دست بدست مقابلہ ہی کرنا نہ پڑتا تھا بلکہ چاروں طرف سے مشرکین کا ہجوم بھی یہ کوشش کرتا ہوگا کہ وہ علم دار قتل نہ ہونے پائے اس لیے آپ کو کتنی دفعہ جنگ مغلوبہ کا سامنا پڑتا ہوگا مگر بالآخر آپ اُس علم دار کو قتل کر دیتے تھے۔ یہ مقابلہ بڑی دیر تک جاری رہا۔ مشرکین کے جگردار افراد بڑھ بڑھ کے علم کو سنبھالتے رہے اور حضرت علیؓ ایک ایک کو قتل کرتے رہے یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا کہ کافی دیر تک علم زمین پر پڑا رہا اور کسی کو اُٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی تو ایک عورت عمرہ بنت علقمہ حارثیہ نے بڑھ کر علم اپنے ہاتھ

---

[۱] طبری، ج ۳ صد ۱۳

میں لے لیا جس پر قریش کو حمیت دامنگیر ہوئی اور انھوں نے اُسے ہٹاکر پھر خود علم کو سنبھالا اور خاندان ابو طلحہ کا ایک حبشی غلام صواب علم دار بنا اور علم کو لے کر اُس نے بڑی دلیری سے جنگ کرنا شروع کی۔ تاریخ کہتی ہے کہ اُس کے ہاتھ قطع ہو گئے تو وہ گھٹنوں کے بھل بیٹھ گیا اور اُس نے علم کو سینہ اور گردن کے سہارے سے سنبھالا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں قتل ہو گیا۔ بس یہ کفار قریش کا آخری علم بردار تھا جس کے بعد کوئی علم کا اُٹھانے والا نہ رہا۔[۱]

یہ حضرت علی بن ابی طالبؑ کی مہم ایسی تھی کہ اگر آپ اسے انجام نہ دیتے تو فوج دشمن کو شکست ہو ہی نہیں سکتی تھی لیکن ظاہر ہے کہ آپ کے لیے اس مہم کے دوران میں یہ ممکن نہ تھا کہ کسی اور طرف متوجہ ہوں اور یہی راز ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے پیغمبر خدا پر حملے ہو سکے اور آپ شدید طور پر زخمی ہو گئے۔

ایک خیال یہ بھی قرین قیاس ہے کہ مشرکین کی پے درپے شکستیں جو علم برداروں کے قتل سے ہو رہی تھیں اور جن سے فوج کا دل تھوڑا ہو رہا تھا۔ انہی کا تدارک اُن کے سرداروں نے یہ سوچا تھا کہ اگر ادھر علم داروں کے قتل سے فوج کی ہمت ٹوٹ رہی ہے تو اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اُدھر خود پیغمبرؐ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ مسلمانوں کے لیے جہاد کا کوئی مرکز ہی باقی نہ رہے اور پھر علی بن ابی طالبؑ کی بھی ہمت

---

[۱] طبری، ج ۳، ص ۱۴

شکست ہو جائے کہ اب رسولؐ رہے ہی نہیں تو میں جنگ کر کے کیا کروں مگر وہ دوسرے ہو سکتے تھے جن کی ہمت پست ہو جائے۔ علی بن ابی طالبؑ نے تو جب یہ آواز سُنی کہ رسولؐ نہیں رہے تو اُنھوں نے اور شدت سے جنگ شروع کر دی کہ جب پیغمبرؐ ہی نہ رہے تو اب میں زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ اس کا نتیجہ تھا کہ آخر بگڑی ہوئی جنگ پھر بنی اور علم کفر کے آخری مرتبہ سرنگوں ہونے پر مجموعی طور پر فوج کے قدم اُکھڑ گئے اور اب حضرت علیؑ کو اتنا موقع ملا کہ آپ آ کر رسولؐ کی خبر لیں۔ اب رسولؐ جہاں زخمی ہو کر گر گئے تھے وہاں سے نکل کر پھر کھڑے ہو گئے تھے اور یہ دیکھ کر فوج مخالف کے کچھ منتشر دستے پھر حضرت پر حملہ آور ہونے لگے تھے مگر اب علیؑ رسولؐ کے پاس آ چکے تھے۔ اس موقع کا تذکرہ مورخ ابن جریر نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

لما قتل علی بن ابی طالب اصحاب الالویة ابصر رسولؐ اللہ جماعة من مشرکی قریش فقال لعلیؑ احمل علیھم فحمل علیھم ففرق جمعھم وقتل عمرو بن عبد اللہ الجمحی قال ثم ابصر رسول اللہ جماعة

جب علی بن ابی طالبؑ نے تمام علم برداروں کو قتل کر دیا، رسول خدا نے ایک جماعت کو مشرکین قریش میں سے دیکھا۔ علیؑ سے فرمایا کہ ان پر حملہ کرو۔ اُنھوں نے اُن پر حملہ کیا، اُن کے مجمع کو منتشر کیا اور عمرو بن عبداللہ جمحی کو قتل کیا، پھر رسول خدا نے ایک دوسری جماعت کو مشرکین قریش

من مشرکی قریش فقال لعلی
احمل علیهم فحمل علیهم
ففرق جماعتهم وقتل
شیبة بن مالك احد بنی
عامر بن لوی فقال جبریل
یارسول الله هذه للمواساة
فقال رسول الله ص انه منی
وانا منه فقال جبریل
وانا منکما قال فسمعوا
صوتا لا سیف الا ذوالفقار
ولا فتی الا علیؑ۔

میں سے دیکھا۔ علیؑ سے فرمایا کہ ان پر حملہ
کرو تو انھوں نے اُن پر حملہ کیا۔ اُن کی
جماعت کو منتشر کیا اور قبیلۂ عامر
بن لوی کے ایک شخص شیبہ بن مالک کو
قتل کیا۔ اس پورے منظر سے متاثر ہو کر
جبرئیل نے کہا یا رسول اللہ بلاشبہ ہمدردی
و غمخواری اس کا نام ہے (جو علیؑ کر رہے ہیں)
رسولؐ نے فرمایا (اس میں تعجب کیا ہے) یقیناً
وہ مجھ سے ہے اور میں اُس سے ہوں۔ جبرئیل
نے کہا اور میں آپ دونوں سے ہوں۔ تو
لوگوں نے ایک آواز سُنی کہ کوئی تلوار سوائے

[illegible]

یہی آواز ہے جو فقرۂ نثر: لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار
کی صورت میں مشہور و معروف ہے۔

شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اس مقابلہ اور جاں نثاری میں
حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے تاثرات، کارناموں اور اُن کے نتیجہ کو
بڑے مکمل اور موثر طریقہ پر درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

از علی مرتضٰے مروی است کہ چوں
کفار بر مسلماناں غلبہ کردند حضرت
از نظر من غائب شد و درمیان

حضرت علی مرتضٰےؑ سے روایت ہے کہ جب
کافروں نے مسلمانوں پر غلبہ کیا تو آنحضرتؐ
میری نظر سے اوجھل ہو گئے۔ میں نے

کشتگاں رفتم و تفحص کردم درمیان
کشتگان نه دیدم با خود گفتم که مگر
حق تعالے بواسطۂ فعل ما بر ما
غضب کرد و پیغمبر خویش را
به آسماں برد گفتم بهتر ازاں نیست
که قتال کنم تا کشته شوم شمشیر
کشیدم و بر مشرکاں حمله کردم و
از هم پاشیدند ناگاه حضرت
را دیدم که به سلامت است ۔

مقتولین میں گردش کی اور تلاش کیا تو مقتولین
میں بھی آپ کو نہ پایا۔ میں نے اپنے سے کہا
کہ شاید خداوند عالم نے ہم لوگوں (مسلمانوں)
کے کردار کے سبب سے ہم پر غضب نازل کیا اور
اپنے پیغمبر کو آسمان پر اُٹھا لیا اب اس سے بہتر
کچھ نہیں ہے کہ میں جنگ کروں یہاں تک کہ
قتل ہو جاؤں۔ میں نے تلوار کھینچی اور مشرکین
پر حملہ کیا اور اُنھیں منتشر کیا تو ایک دفعہ
حضرت کو دیکھا کہ آپ زندہ سلامت ہیں۔

پھر لکھتے ہیں :-

منقول است که چوں مسلمانان
روے به هزیمت آوردند و حضرت
را تنها گزاشتند حضرت در غضب
آمد و عرق از پیشانی همایونش
متقاطر گشت و مثال مروارید
از جبین مبینش فرود وید دراں
حالت نظر کرد علی بن ابی طالب را
دید که به پہلوے وے ایستاده است
فرمود چونست که تو به برادران خود

روایت میں ہے کہ جب مسلمانوں نے
پسپائی اختیار کی اور آنحضرتؐ کو اکیلا
چھوڑ دیا تو حضرت غضب ناک ہوئے
اور پسینے کے قطرے آپ کی پیشانی اقدس سے
ٹپکنے لگے اور موتیوں کی طرح آپ کی جبین
انور سے گرنے لگے اسی عالم میں آپ نے نظر
نظر اٹھائی تو علی بن ابی طالبؑ کو دیکھا کہ
وہ آپ کے پہلو میں کھڑے ہیں فرمایا
کیوں تم بھی اپنے دوسرے بھائیوں میں

ملحق نہ گشتی علی گفت ۱۱ کفر
بعد الایمان ان لی باش
اسوۃ آیا کافر شوم بعد از ایمان
بدرستی مرا تجوا فتدا ست یعنی مرا
بشما کار است با یاران برادراں
کہ در پے غنیمت رفتند و ہزیمت
نمودند چہ کار دارم دریں حین جمعے
از کافراں متوجہ آں حضرت
شدند فرمود اے علی مرا ازیں
جمع نگاہ دار د حق خدمت نصرت
بجائے آر کہ وقت نصرت ست
علی مرتضےٰ رضی اللہ عنہ متوجہ
آں قوم شد و مارا از روزگار
شاں برآورد و ایشاں را متفرق
گردانید و جمعے کثیر را بہ دوزخ
فرستاد ـــــ و مے گویند کہ
چوں علی مرتضےٰ ایں مردانگی
کردہ داد نصرت داد جبریل بہ
آں حضرت گفت کہ ایں کمال

شامل نہ ہوگئے۔ علیؓ نے کہا کہ کیا میں
ایمان کے بعد کافر ہو جاتا۔ میرے لیے
تو آپ کی سیرت مثالی نمونہ ہے یعنے
مجھے آپ سے مطلب ہے۔ اُن دوستوں اور
بھائی بندوں سے جو مال غنیمت کے پیچھے
گئے اور فرار اختیار کیا مجھے کیا مطلب
اسی حالت میں کافروں کی ایک جماعت
نے حضرت کی طرف رُخ کیا۔ فرمایا
یا علی اس مجمع کو دفع کرو اور خدمت
وامداد کا حق ادا کرو کہ یہ مدد کا
وقت ہے، حضرت علی اُس جماعت
کی طرف متوجہ ہوے اور اس کا قلع قمع
کرکے اُسے متفرق کیا اور بہت سے
لوگوں کو واصل جہنم کیا ـــــ
راویوں کا بیان ہے کہ جب
حضرت علیؓ نے اس بہادری سے
کام لیا، امداد کا حق ادا کیا تو
جبریل نے پیغمبر سے کہا کہ
یہ انتہائی غم خواری اور

مواساة وجواں مردی است کہ
علی با قومی برد آنحضرت فرمود
انا منی وانا منہ یہ درستی
علی از من است ومن از ویم
کنایتیست از کمال اتحاد و
اخلاص ویگانگی وآمدہ است
کہ چوں آنحضرت ایں کلمہ را
فرمود جبریل گفت انا منکما
من از شما ہر دو یم، و می گویند
آوازے شنیدند کہ گویندہ
غیبی می گفت لا فتےٰ الا علی
و لا سیف الا ذو الفقار ـــ
ظاہر اقصۂ ناد علیا مظہر
العجائب ہم دریں قتال و
معرکہ واقع شدہ است اما در
کتب حدیث ذکر نہ کردند با لجملہ وے
رضی اللہ عنہ حق مبارزت ومحاربت
وجلادت وشجاعت بجائے آوردہ
کہ فوق آں تصور نہ تواند کرد۔[1]

بہادری ہے جو علیؑ آپ کے ساتھ
کر رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ وہ
مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں،
یہ اشارہ ہے انتہائی اتحاد اور
خلوص اور یگانگی کی طرف اور وارد
ہوا ہے کہ جب حضرت نے یہ جملہ
فرمایا تو جبریل نے کہا اور میں آپ
دونوں سے ہوں۔ اور کہا جاتا ہے
کہ ایک آواز سنی کہ غیبی کہنے والا
کہہ رہا ہے لا فتےٰ الا علی
لا سیف الا ذو الفقار ـــ
غالباً ناد علیا مظہر العجائب
کا واقعہ بھی اسی سال اور اسی
جنگ میں ہوا ہے مگر کتب احادیث
میں اس کا ذکر نہیں ہے ـــ الحاصل
آں جناب (حضرت علیؑ) نے مقابلہ
اور جنگ اور دلیری اور بہادری کا
ایسا حق ادا کیا جس سے بالاتر تصور
میں نہیں آسکتا۔

[1] مدارج النبوۃ۔

ہمارے یہاں بھی مضمون یعنی پیغمبرؐ کی پیشانی سے فرطِ غضب کی بنا پر موتیوں کی طرح پسینے کے قطروں کا ٹپکنا اور پھر حضرت علیؑ پر نظر پڑنا اور فرمانا کہ تم بھی کیوں نہ چلے گئے اور آپ کا جواب کہ الکفر بعد الایمان اور پھر رسولؐ کا علیؑ سے مُعانقت کے لیے فرمانا اور جبریلِ امین کا مکالمہ یہ سب امام جعفر صادقؑ کی روایت سے وارد ہوا ہے[۱]۔

ہزاروں کے لشکر سے تن تنہا جنگ میں فطری طور پر آپ کو خود زخمی بھی ہونا چاہیے تھا، چنانچہ اسے بھی محدث دہلوی نے درج کیا ہے:-

روایت است از قیس کہ وے از پدرش سعد روایت کرد کہ گفت از علی مرتضےٰ شنیدم کرم اللہ وجہہ کہ فرمود روز اُحد شانزدہ ضربت بہ من رسید کہ در چہار ضربہ از آں بر زمین افتادم[۲]۔

قیس بن سعد بن عبادہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت علی مرتضےٰؑ سے سُنا خود آپ نے فرمایا کہ غزوۂ اُحد کے دن سولہ زخم مجھ کو لگے جن میں سے چار زخم ایسے تھے کہ اُن سے میں زمین پر گر گیا تھا۔

مذکورہ بالا واقعات کی رفتار میں یہ بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ فرار ہونے والی جماعت میں سے کچھ بزرگوار جو واپس آئے جن میں سے بعض کی زبانی آچکا ہے کہ میں سب سے پہلے واپس آیا تھا، یہ واپسی

[۱] اعلام الوریٰ [۲] مدارج النبوۃ

کس وقت تھی؟ کیونکہ علَم داروں کے قتل کے بعد جب فوج دشمن دوبارہ پلٹ پڑی ہوئی تو اُس وقت کی صورت حال ابھی آ چکی ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ بالکل تنہا تھے۔ پھر جس وقت حضرت علیؑ آپ کے پاس پہونچ چکے ہیں اُس وقت بھی کافی دیر تک آپ تنہا ہی منظر آتے ہیں، چنانچہ اس وقت بھی بس رسولؐ اور علیؑ ہی نظر آتے ہیں جب حضرت علیؑ سپر میں پانی بھر کر لائے اور حضرتؐ کے چہرہ سے خون دھویا اور کچھ پانی سر مبارک پر ڈالا۔[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب فوج دشمن کے مختلف دستوں کے منتشر حملے بھی ناکام ہو چکے اور اب جنگ بالکل رک گئی اس کے کافی دیر کے بعد آس پاس سے جو افراد مختلف پناہ گاہوں میں نتیجہ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے اور بہت دُور نہیں گئے تھے وہ رسولؐ کے پاس واپس آ گئے، یا یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ حضرات بیچ میں واپس آ گئے ہوں اور پھر شدّت وقت کو طاقت برداشت سے باہر پاکر روانہ ہو گئے ہوں۔

ہندہ کا جوشِ انتقام

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے تاریخ نے ترتیب تو لکھی نہیں مگر صورت حال کی نوعیت سے یقین یہی ہوتا ہے کہ یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب میدان جنگ مسلمان فوجیوں سے بالکل خالی ہوا اور جنگ کا

---

[1] طبری، ج ۳، صفحہ ۲۰

ہنگامہ بھی ختم ہو چکا ہو اور یہ وہی وقت ہو سکتا ہے جب حضرت علی بن ابی طالبؑ رسولؐ کی خدمت میں تھے۔ ہندہ نے مع اپنے ساتھ کی عورتوں کے یہ کام انجام دیا کہ مسلمان مقتولین کے اعضاؤ جوارح قطع کرائے۔ علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ کسی شہید کی لاش محفوظ نہیں رہی تھی سوا حنظلہ بن عامر کے جن کا باپ مشرکین کے ساتھ تھا اُس کے لحاظ سے اُن کی لاش کو بغیر مثلہ کیے ہوئے چھوڑ دیا۔[۱]

سب سے زیادہ نشانۂ ظلم حضرت حمزہ کی لاش بنائی گئی۔ ہندہ نے آپ کا شکم چاک کرا کے کلیجہ نکلوایا اور منھ میں رکھ کر چبانا چاہا مگر جب نہ سکا تو زمین پر تھوک دیا، اور تمام مقتولین کے ناک اور کان جو قطع کرائے تھے اُن کا گلوبند بنایا اور اپنے گلے میں پہنا اور اپنا گلوبند اور گوشوارے وغیرہ سب انعام میں وحشی، قاتل جناب حمزہؑ کو دے دیا۔ پھر ایک بڑی چٹان پر بلند آواز سے فخریہ کچھ اشعار جو اُس نے نظم کیے تھے پڑھنے لگی۔[۲]

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں :—

"خاتونانِ قریش نے انتقامِ بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بدلا لیا۔ ان کے ناک کان کاٹ لیے۔ ہندہ (معاویہ کی ماں) نے ان کو پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا۔ حضرت حمزہ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی لیکن گلے سے

---

[۱] اعلام الوریٰ [۲] طبری، ج ۳، ص ۲۲۵-۲۲

نیچے نہ اُتر سکا۔ اس لیے اُگل دینا پڑا۔ تاریخوں میں ہندہ کا لقب جو
جگر خوارہ لکھا جاتا ہے اسی بنا پر لکھا جاتا ہے[۱]"
ابن عبدالبر نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اُس نے حضرت حمزہ کے
جگر کو انگارہ دل پر بھون کر کھا لیا[۲]۔

جنگ کے بعد

جنگ ایسے عالم میں ختم ہوئی کہ کسی ایک فریق میں بھی اُس وقت اتنا دم نہ تھا کہ وہ دوسرے سے کوئی تعرض کر سکے اس لیے اُس وقت جیسے ہر ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن تھا۔ اگرچہ بالآخر پھر فتح اسلام کی ہوئی تھی مگر وہ حقیقتاً اسلام ہی کی فتح تھی۔ مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی تو میدان سے اس طرح فرار کیا کہ زمین و آسمان کو اپنی شکست کا گواہ بنا دیا۔ پھر پیغمبر خدا کا زخموں سے چور ہونا۔ ستر مسلمانوں کا خاک و خون میں بے جان لاشوں کی صورت میں پڑا ہونا اور خصوصیت کے ساتھ حمزہ ایسے خدا و رسول کے شیر کا میدان میں کام آنا اور پھر پیغمبر کے پاس اب سوا ایک مددگار کے جو خود بھی اتنا زخمی ہو چکا تھا کہ کئی مرتبہ نڈھال ہو کر جنگ میں زمین پر گر چکا تھا اور صرف روحانی مدد کے سہارے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جس مدد کے لیے شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی روایت ہے کہ رسول خدا نے فرمایا تھا

---

[۱] سیرت النبی، ج ۱، ص ۲۷۳ [۲] استیعاب، ج ۲، ص ۲۸۶

کہ وہ جبریل امین تھے جنھوں نے ہر مرتبہ علیؑ کو کھڑا کر دیا۔[1]

اس صورت حال میں اب کہاں اس کا موقع تھا کہ حضرت علیؑ از خود دشمنوں کا تعاقب کرتے یا اُن پر جب کہ وہ جنگ سے ہاتھ اُٹھا چکے تھے اپنی طرف سے حملہ کرتے۔

دوسری طرف مشرکین کی یہ صورت حال تھی کہ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے اُن کا جانی نقصان زیادہ نہ ہوا تھا مگر اُن کی فوج کے جتنے علم بردار تھے وہ سب قتل ہو گئے تھے۔ اصل میں بڑے آدمیوں کا تو مکمل صفایا جنگ بدر ہی میں ہو چکا تھا۔ اب یہ طلحہ بن ابی طلحہ وغیرہ چند آدمی جو اس جنگ میں نمایاں تھے وہ سب بھی قتل ہو گئے۔ اب فوج جس کا نام تھا وہ عوام کی بھیڑ تھی یا ایک سالار لشکر ابوسفیان تھا جسے اپنی جان کی خیر منانا تھی۔ اُس نے دیکھا کہ علیؑ ایک۔ وہ ہیں جن کا پوری فوج کچھ نہ بنا سکی اور انھوں نے ایک اکیلے تمام علم داروں کا خاتمہ کر دیا تو وہ جانتا تھا کہ اب اگر جنگ ہو تو میری ہی باری ہے۔ اس لیے اب اُس میں بھی ہمت نہ تھی کہ وہ دوبارہ جنگ کو چھیڑے۔ یہ ہے جنگ کے بعد کی کیفیت جس میں ہم ایسے واقعات دیکھتے ہیں جو پُر امن فضا اور اطمینانی صورت حال ہی میں ہو سکتے ہیں۔ اُدھر حضرت علی بن ابی طالب اپنی سپر کو اُلٹ کر اُس میں پانی لاتے ہیں اور پیغمبر خداؐ کے زخموں کو دھوتے ہیں۔ اُدھر ابوسفیان میدان میں بہ اطمینان پھر رہا ہے

---

[1] مدارج النبوۃ۔

اور لاشوں کا معائنہ کر رہا ہے اور اُس کی نظر اُن لاشوں پر پڑتی ہے جنھیں مثلہ کیا گیا تھا اور خصوصیت سے جناب حمزہؓ کی لاش جس کی کیفیت پہلے بیان ہو چکی ہے، اس سے معلوم نہیں اُس کے ضمیر نے شرمندگی محسوس کی یا کیا کہ اُس نے پہاڑ پر چڑھ کر بلند آواز سے رسولؐ کو مخاطب کیا۔

مؤرخین جمہور کا بیان ہے کہ اس وقت کچھ مسلمان بھی رسولؐ کے پاس موجود تھے اور مشرکین ابھی تک اس گو مگو میں تھے کہ پیغمبرؐ خدا کیا واقعی شہید ہو گئے یا بقید حیات ہیں، چنانچہ ابو سفیان نے پہاڑ پر چڑھ کے صدا بلند کی۔

لنا العزّیٰ ولا عزّیٰ لکم۔	عزّیٰ (بت) ہمارا مددگار ہے اور تمھیں عزّیٰ نصیب نہیں۔

رسولؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا اس کا جواب دو کہ :-

اللہ مولانا ولا مولےٰ لکم۔	اللہ ہمارا سرپرست ہے، اور تمھارا کوئی سرپرست نہیں۔

اس جواب کو سُن کر ابو سفیان نے پوچھا کہ کیا محمدؐ تم میں ہیں؟ معلوم ہونا چاہیے کہ تمھارے مقتولین میں کچھ مثلہ ہوئے ہیں جس کا میں نے حکم نہیں دیا تھا ہاں منع بھی نہیں کیا تھا اور اب بھی مجھے اس کی نہ کوئی خوشی ہے اور نہ غم ہے۔[1]

---

[1] طبری، ج ۳، ص ۲۱

دوسری روایت میں یہ ہے کہ ابوسفیان نے پہاڑ کے اوپر چڑھ کے اُن مسلمانوں سے جو رسولؐ کے پاس اُس وقت تھے پکار کر پوچھا کہ کیا تم میں محمدؐ ہیں؟ دو دفعہ اُس نے یہ سوال کیا۔ حضرتؐ نے فرمایا جواب نہ دو۔ پھر اُس نے تین مرتبہ پوچھا کہ کیا تم میں ابن ابی قحافہ (ابوبکر) ہیں۔ حضرتؐ نے فرمایا چپ رہو۔ پھر اُس نے تین مرتبہ کہا کہ کیا تم لوگوں میں ابن خطاب (عمر) ہیں؟ حضرتؐ نے فرمایا، اب بھی جواب نہ دو۔ یہ سُن کر ابوسفیان نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ لو یہ سب تو قتل ہو گئے، اگر زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ بس یہ سُن کر حضرت عمر کو تاب نہ ہوئی اور کہا اے دشمن خدا تو جھوٹا ہے۔ ہم لوگ زندہ موجود ہیں۔ اب ابوسفیان نے "ہبل (بُت) زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔ رسولؐ نے فرمایا اب اس کا جواب دو! لوگوں نے پوچھا کیا کہیں؟ آپ نے فرمایا کہو کہ اللہ بلند و برتر ہے۔ اب ابوسفیان نے وہ صدا بلند کی کہ ہمارے لیے عزیٰ ہے اور تمہارے پاس عزیٰ نہیں ہے۔ رسولؐ نے فرمایا اس کا جواب دو! لوگوں نے پوچھا کیا کہیں؟ آپ نے فرمایا کہو اللہ ہمارا سرپرست ہے، اور تمہارا کوئی سرپرست نہیں ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ آج بدر کا بدلا ہو گیا اور جنگ کے لیے تو مشہور ہی ہے کہ "دو سر دارد" مگر تمہاری جماعت کے کچھ لاشے مثلہ ہوئے ہیں۔ میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا مگر مجھے اس کا کوئی غم بھی نہیں ہے۔[1]

---

[1] طبری، ج ۳، صـ ۲۳-۲۴

اس آخری فقرہ کو جو دونوں روایتوں میں ہے ضمیر کی شرمندگی کو چھپانے کی خیرہ چشمی کے ساتھ کوشش بھی سمجھا جا سکتا ہے اور ایک طرح سے "نمک بر جراحت" بھی، لیکن علامہ طبرسی کی روایت سے ابھی تک پیغمبر خداؐ کے پاس سوا حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے کسی دوسرے کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابوسفیان نے پکار کر کہا کہ ارے کیا ابن ابی کبشہ (یہ وہ لفظ ہے جس سے کفار قریش پیغمبر خداؐ کو یاد کیا کرتے تھے) بھی زندہ ہیں؟ ابن ابی طالبؑ کو تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ تو موجود ہیں۔ اس پر حضرت علیؑ نے ہی پکار کر جواب دیا کہ ہاں قسم اُس کی جس نے اُن کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ یقین مانو کہ وہ تمھاری بات خود سُن رہے ہیں۔ اُس نے کہا اچھا تو سنو کہ تمھارے مقتولین میں کچھ مثلہ کیے گئے ہیں۔ بخدا میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا اور نہ اس سے منع کیا تھا۔ اور اب ہمارے تمھارے درمیان آئندہ سال اسی مہینہ میں بدر کے میدان میں مقابلہ ہوگا۔ ابن قمیئہ نے مجھے بتایا تھا کہ اُس نے محمدؐ کو قتل کیا ہے مگر تم میرے نزدیک ابن قمیئہ سے زیادہ سچے ہو۔[1]

بھائی کی لاش پر بہن کی آمد

شہر کے اندر جناب حمزہؑ کی شہادت کی خبر پہونچ گئی جسے سُن کر

---

[1] اعلام الوریٰ۔

جناب صفیہ خواہر جناب حمزہؓ میدان اُحد کی طرف روانہ ہو گئیں۔ رسولؐ کو اس کا علم ہوا۔ پہلے تو آپ نے اُن کے صاحبزادے کو بھیج کر روکنے کی کوشش فرمائی کہ وہ اپنے بھائی کی لاش اس عالم میں نہ دیکھ سکیں گی، مگر جب اُنھوں نے کہا کہ مجھے تو معلوم ہو چکا ہے کہ اُن کی لاش کی کیا کیفیت ہے اس لیے مجھے روکنے سے کوئی فائدہ نہیں[1]۔ تو آپ نے یہ اہتمام فرمایا کہ اُن کے آنے سے پہلے حمزہؓ کی لاش پر چادر ڈال دی جائے، پھر بھی پیر کھلے رہ گئے تو انھیں گھانس اور پتے جمع کر کے چھپایا گیا۔ صفیہ جب لاش پر آئیں اور دعائے مغفرت کر کے واپس ہونے لگیں تو ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگیں۔ اس موقع پر خود پیغمبرؐ بھی اُن کے ساتھ شریک ماتم تھے اور شدت کے ساتھ گریہ فرما رہے تھے[2]۔

ایک خاتون کا جذبۂ ایمانی

بنی نجار کی ایک ضعیف العمر خاتون جن کے باپ، شوہر اور بھائی تینوں اُحد میں شہید ہو گئے۔ وہ پیغمبر خداؐ کے قریب آئیں جب کچھ مسلمان آپ کے پاس آ چکے تھے اور پیغمبرؐ کو گھیرے ہوئے تھے، انھوں نے بے تابانہ کہا ارے رسولؐ زندہ ہیں؟ لوگوں نے کہا ہاں۔ رسولؐ زندہ ہیں، کہنے لگیں مجھے ایک نظر رسولؐ کو دیکھ لینے دو۔

---

[1] طبری، ج ۳، ص ۲۵ [2] تاریخ خمیس دیار بکری۔

لوگوں نے جو حلقہ کیے ہوئے تھے راستا دیا۔ بس وہ آئیں اور کہنے لگیں آپ زندہ ہیں تو سب مصیبتیں اس کے بعد آسان ہیں[۱]۔

عبرت ناک

ظاہری آنکھیں تو پیغمبرؐ کے ساتھ رہنے ہی کو دیکھتی ہیں اور اسی کو اپنی عقیدت کا معیار بنا لیتی ہیں۔ چہ جائیکہ پھر پیغمبرؐ کی نصرت میں جنگ کرنا۔ اس کے دو ہی نتیجے سمجھ میں آتے ہیں۔ زندہ رہے تو غازی اور مر گئے تو شہید اور جب شہید ہوئے تو حسن انجام میں شک ہی کیا، مگر چک دار پردوں کے پیچھے کیسی تاریکیاں چھپی ہوتی ہیں اسے جنگ اُحد نے دو مثالوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ایک میں غازی کی نقاب کشائی ہوئی ہے اور دوسرے میں ظاہری طور پر ایک شہید کی۔

پہلا واقعہ حاطب بن اُمیہ بن رافع کا ہے جو ایک سن رسیدہ آدمی تھا اور ظاہر ہے کہ جنگ اُحد میں جو ہجرت کے تیسرے ہی سال ہوئی ہے جو مسلمان موجود ہو وہ کسی نہ کسی درجہ تک سابقین ہی میں محسوب ہو سکتا ہے۔ اس کا جوان فرزند یزید بن حاطب معرکہ کارزار میں زخمی ہو گیا اور گھر لاتے لاتے اُس کی حالت خراب ہو گئی۔ تمام مسلمانوں نے اُسے جنت کی بشارت دینا شروع کی۔ حاطب

---

[۱] اعلام الوریٰ۔

بولا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان بشارتوں میں کوئی اصلیت بھی ہے یا نہیں؟ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اس بھولے بھالے جوان کو تم لوگوں نے دھوکا دے کر بے کار جان لی اور مجھے اس ضعیفی میں اُس کا داغ دیا۔

دوسرا شخص قزمان مسلمانوں کی جماعت میں شامل تھا اور روز اُحد اُس نے سخت جنگ کی اور آٹھ نو مشرکین کو قتل کیا۔ آخر زخمی ہو کر گرا، اور اُسے اُٹھا کر معرکۂ جنگ سے لے گئے۔ مسلمانوں نے کہنا شروع کیا کہ اے قزمان جنت مبارک ہو۔ وہ کہنے لگا کہ تم مجھے کیا بشارت دیتے ہو۔ میں نے تو اپنی قوم کی حمایت میں جنگ کی اور ایسا نہ ہوتا تو کبھی جنگ نہ کرتا۔ اس کے بعد جب زخم کی تکلیف زیادہ ہوئی تو اُس نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور اپنی شہ رگ کو قطع کر دیا جس سے خون بہنا شروع ہوا۔ اس طرح خودکشی کر کے اُس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا[۵۲]۔

ان مسلمانوں کے ساتھ ایک یہودی کا کردار بھی یاد رکھنے کا ہے۔ اس کا نام مخیریق تھا۔ جب اُحد میں جنگ کی حالت دگرگوں ہوئی اُس نے یہودیوں سے کہا کہ تمھیں محمدؐ کی حمایت لازم ہے۔ اُنھوں نے کہا آج ہفتہ کا دن ہے جس میں ہم کوئی کام نہیں کرتے۔ اُس نے کہا ہفتہ وفتہ کچھ نہیں۔ یہ کہہ کے اُس نے ہتھیار لگائے اور چلتے وقت کہا کہ اگر میں قتل ہو جاؤں تو میرا تمام مال محمدؐ کا ہے، وہ جو چاہیں کریں، اور میدان میں پہنچ کر جنگ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ رسولؐ کی حمایت میں قتل ہو گیا[۵۳]۔

---

۵۲ طبری، ج ۳، صفحہ ۲۹

۵۳ طبری، ج ۳، صفحہ ۲۱

دفن شہداء

ابن الوردی نے لکھا ہے کہ پیغمبر خدا نے پہلے تو حمزہؓ کی نماز جنازہ پڑھائی اور سات تکبیریں کہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ فضیلت کے لحاظ سے میت کے لیے دعا و استغفار کے ساتھ تکبیروں میں اضافہ ہوتا ہے۔ پھر دوسرے مقتولین کی لاکر حمزہ کے پہلو میں رکھے جاتے تھے اور حضرت حمزہؓ کی شرکت کے ساتھ ان سب کی نماز جنازہ پڑھاتے تھے۔ اس طرح سے تمام مقتولین کی نماز پڑھائی اور مجموعی طور پر بہتر مرتبہ نماز ہوئی جن میں سے ہر ایک میں حمزہؓ شریک تھے۔ پھر حمزہ کو علیحدہ دفن فرمایا اور دو شہیدوں کو جو عمرو بن جموح اور عبداللہ بن عمرو بن حرام تھے، حضرت نے فرمایا ان میں زندگی میں بڑا اتحاد تھا لہذا ان دونوں کو ایک قبر میں دفن کردو[1]۔ اور تمام شہداء کو علیحدہ ایک ساتھ دفن کیا۔ ایک روایت ہے کہ کچھ لوگ اپنے مقتولین کو اٹھا کر مدینہ لے گئے اور وہاں دفن کیا، پھر پیغمبرؐ نے منع فرمایا اور کہا کہ جہاں ان کا مقتل ہے وہیں ان کا مدفن ہونا چاہیے۔

مراجعت

پہلے صورت حال پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ اختتام جنگ

---

[1] طبری، ج ۳، صد ۲۱

[2] طبری، ج ۳، صد ۲۶

ایسے عالم میں ہوا تھا کہ اب دونوں جماعتوں میں سے کسی میں مقابلہ کی سکت نہ تھی، چنانچہ ابوسفیان نے رسول اللہؐ کے جائے قیام کے قریب آکر اعلان کیا کہ اب ہم سے تم سے مقابلہ آئندہ سال بدر میں ہوگا۔ رسول خداؐ نے اپنے اصحاب میں سے کسی سے کہا کہ کہہ دو اچھا یہی ہمارے تمہارے درمیان وعدہ رہا۔ اس پر ابوسفیان واپس چلا گیا مگر بہ ظاہر اسباب بعید سہی پھر بھی امکان اس کا تھا کہ یہ جنگی سیاست کا کوئی کرتب ہو اور غفلت میں پھر حملہ ہو جائے۔ اس لیے احتیاطاً پیغمبر خداؐ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کو بھیجا کہ ان کے پیچھے جاؤ اور دیکھو کہ یہ کیا کرتے ہیں۔ اگر یہ کوتل گھوڑوں کو ساتھ لیے جا رہے ہوں اور خود اونٹوں پر سوار ہوں تو یقین کر لینا چاہیے کہ وہ مکہ کی طرف واپس جا رہے ہیں اور اگر گھوڑوں پر سوار ہوں اور اونٹوں کو خالی ساتھ رکھا ہو تو سمجھنا چاہیے کہ مدینہ پر حملہ کا ارادہ ہے۔ پھر مجھے فوراً مدینہ جاکر ان کا مقابلہ کرنا ہے۔ حسب ہدایت حضرت علیؑ گئے اور صورت کو پہلی ہی شکل میں پایا اور آپ نے واپس آکر پیغمبرؐ کو اطمینان دلا دیا کہ وہ اب جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے اور بالکل واپس جا رہے ہیں۔

یہ اطمینان حاصل ہونے کے بعد پیغمبر خداؐ نے بھی مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی[1]

---

[1] طبری، ج ۳، صفحہ ۲۴

شہدا کا ماتم

مؤرخ ابن جریر کی روایت ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ بنی عبد الاشہل اور بنی ظفر کے مکانات کی طرف سے گزرے جو انصار کے دو قبیلے تھے تو حضرتؐ نے سُنا کہ عورتیں اپنے عزیزوں پر جو جنگ اُحد میں شہید ہوئے نوحہ و ماتم کر رہی ہیں۔ اس سے خود پیغمبر خداؐ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ پھر فرمایا:۔

لکن حمزۃ لا بواکی له — مگر حمزہ پر رونے والیاں نہیں ہیں۔

سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر دونوں صحابی جو انصار میں سے تھے واپس ہوئے تو انھوں نے خواتین کو ہدایت کی کہ وہ جائیں اور عم رسولؐ کا ماتم کریں۔ له

علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ یہ تمام خواتین حضرت فاطمہ زہراؑ کے پاس آئیں اور آپ کو جناب حمزہؑ کا پُرسا دیا۔ رسول خداؐ جب مسجد میں تشریف لے جانے لگے اور حضرت فاطمہ زہراؑ کے دروازے پر پہونچے تو رونے کی آواز سُنی۔ آپ نے ان خواتین کے لیے دعائے خیر کی اور فرمایا تم نے ہمدردی و غمخواری کا حق ادا کیا۔ ٢له

قدیم ترین مؤرخ ابن سعد کاتب واقدی نے لکھا ہے کہ اس کے

له طبری، ج ٣، ص ٢٧

٢له اعلام الوری

بعد خواتین انصار میں یہ رسم جاری ہو گئی کہ جب کسی کا کوئی عزیز دنیا سے اُٹھتا تھا تو پہلے حمزہؑ کا نام لے کر رویا جاتا تھا، پھر اپنے مرنے والے پر گریہ ہوتا تھا۔[۱]

نبیؐ و علیؑ کی تلواریں فاطمہ زہراؑ کے ہاتھ میں

عام تصور یہ ہے کہ حضرت پیغمبر خداؐ نے بہ نفس نفیس کبھی جنگ نہیں فرمائی مگر یہ جنگ اُحد کے علاوہ اور دوسرے غزوات کی حد تک تصور درست معلوم ہوتا ہے، مگر جنگ اُحد میں پہلے بھی ذکر آچکا ہے کہ حضرت رسولؐ سے جب کہ آپ کے پاس سوا علیؑ کے جو قلب فوج میں علم دار دلکے قتل کی مہم میں مصروف تھے کوئی نہیں رہ گیا تھا تو پیغمبر خداؐ نے خود بھی جنگ فرمائی۔ آپ کے ہاتھ سے ایک زخمی ہو کر ہلاک ہونے والے کا ذکر بھی آچکا ہے۔ اب اس کا مزید ثبوت تاریخ سے ملتا ہے کہ جب آپ مدینہ واپس ہوئے اور بیت الشرف میں داخل ہوئے تو آپ نے اپنی تلوار حضرت فاطمہؑ کو دی اور فرمایا کہ بیٹی! اس سے اس خون کو جو اس پر ہے دھو کر اسے صاف کر دو اور حضرت علیؑ نے بھی اپنی تلوار حضرت فاطمہ زہراؑ کو دی اور فرمایا اسے بھی دھو دینا کہ بخدا اس نے میرے ساتھ آج بھی وفاداری کی۔ اس موقع پہ دیوان حضرت علیؑ میں چند شعر بھی وارد ہیں جنھیں مورخ

---

[۱] طبقات ابن سعد از روئے حوالہ تاریخ احمدی صفحہ ۴۵-۴۶

ابن جریر نے ان الفاظ میں درج کیا ہے کہ

زعموا ان علی بن ابی طالب حین اعطیٰ فاطمۃ علیہا السلام سیفہ قال :-	لوگ خیال کرتے ہیں کہ جب علی بن ابی طالبؑ نے حضرت فاطمہؑ کو اپنی تلوار دی تو یہ کہا :-

" زعموا " کی لفظ اگرچہ ضعف روایت کا پتہ دیتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مؤرخ کو اس کی صحت پر اطمینان نہیں ہے مگر اس سے یہ تو ظاہر ہی ہوتا ہے کہ یہ اشعار چوتھی صدی ہجری میں جو طبری کا زمانہ ہے شہرت حاصل کر چکے تھے اور اس لیے اُن کی قدامت میں شبہہ نہیں ہے۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں :-

افاطم ھاک السیف غیر ذمیم ۔۔۔ فلست برعدید ولا بملیم
لعمری لقد قاتلت فی حب احمد ۔۔۔ وطاعۃ رب بالعباد رحیم
وسیفی بکفی کالشھاب اھزہ ۔۔۔ اجذ بہ من عاتق وصمیم
فما زلت حتی فض ربی جموعھم ۔۔۔ وحتی شفینا نفس کل حلیم[1]

(یعنی) اے فاطمہؑ لو یہ تلوار جس کی کوئی مذمت نہیں ہو سکتی کہ میں نہ پریشان ہونے والا ہوں، نہ مضطرب۔ قسم ہے کہ میں نے جنگ کی ہے پیغمبرؐ کی محبت اور پروردگار عالم کی اطاعت میں، اور میری تلوار میرے ہاتھ میں مثل شہاب ثاقب کے تھی جس کو میں حرکت دے کر بڑے بڑے مردان جنگی کا خاتمہ کر رہا تھا، تو برابر میں مقابلہ کرتا رہا

---

[1] طبری، ج ۳، صہ ۲۷

یہاں تک کہ پروردگار نے اُن کے دستوں کو منتشر کیا اور دلوں کو اطمینان نصیب ہوا۔

غزوۂ حمراء الاسد

مؤرخین کا بیان ہے کہ مدینہ میں واپسی کے بعد دوسرے ہی دن یعنی روز یکشنبہ ۱۶ ر شوال کو جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ ہم دشمن کے تعاقب میں جائیں گے اور وہی ہمارے ساتھ چلیں جو کل کے معرکہ میں موجود تھے۔ چنانچہ تمام جنگ احد میں شریک ہونے والے مسلمان جن میں بہت سے زخمی تھے اور اُن کے پاس سوار ہونے کے لیے مرکب تک نہ تھے، اس ارشاد کی تعمیل میں حضرتؐ کے ساتھ روانہ ہوئے اور حضرتؐ ان کے ساتھ حمراء الاسد تک جو مدینے سے آٹھ میل ہے تشریف لے گئے اور وہاں تین دن ٹھہرے رہے مگر مشرکین تو مکہ کی طرف جا چکے تھے لہذا آپ تین دن وہاں ٹھہرنے کے بعد مدینہ واپس ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ اقدام صرف یہ دکھلانے کے لیے تھا کہ ہم کل کے واقعہ سے ہمت نہیں ہارے ہیں اور ہم میں لڑنے کی سکت باقی ہے۔ مگر اختتام جنگ کی جو صورت پہلے درج ہو چکی ہے اور وہ خود انہی مؤرخین نے لکھی ہے کہ دونوں طرف سے قول قرار ہو گیا کہ

سلہ طبری، ج ۳، صفحہ ۲۸

اب آئندہ سال مقابلہ ہوگا۔ اس کے بعد ہمیں درایتی طور پر یہ حکایت ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ نیز کل مسلمانوں سے جو علمی کمزوریاں نمایاں ہوئیں وہ اتنی زیادہ نمایاں تھیں کہ اس کے بعد اس طرح کا کوئی نمائشی مظاہرہ کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ جب کہ پیغمبر خداؐ حضرت علیؑ کو بھیج کر یہ اطمینان کر چکے تھے کہ مشرکین مکہ چلے گئے ہیں اور واپسی کا ارادہ نہیں رکھتے تو پھر اس طرح کی نمائش ہمیں تو شان رسالت کے مطابق بالکل معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے ہم اس کی تصدیق سے قاصر ہیں۔

ہمارا خیال تو یہ ہے کہ یہ روایت خوش عقیدہ مورخوں ہی نے وقوع میں آئی ہوئی کمزوری کو چھپانے اور مسلمانوں کی وفاداری کو امکانی حد تک پایۂ ثبوت کو پہونچانے کے لیے تصنیف فرمائی ہے۔ والسلام

علی نقی النقوی

۷ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ

(لکھنؤ)

रविके इल्हाम

भाग-2